نگار

مدیر خصوصی :- نیاز فتحپوری

جلد ۵۲	فہرست مضامین دسمبر ۱۹۴۷ء	شمار ۶

ملاحظات ---------- ۳
بچوں کی نفسیات ---- محمد عظیم ---------- ۵
انشاء اللہ خاں کی مثنویاں ... رحمت نبی خاں ام۔ اے (علیگ) ۱۰
عرفی شیرازی ... (ڈاکٹر) نذیر احمد ام۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی ... ۲۳
عہد عباسی کا ایک تاریخی واقعہ ---------- ۴۵
جذبات عالیہ اور اردو شاعری ... ولی کمال خاں ام اے ... ۴۹
منظومات .... نازش، عرشی، کلیم، درد ۵۵
دلچسپ معلومات ---------- ۵۷
مطبوعات موصولہ ---------- ۵۹
اشتہارات ---------- ۶۳

اس سال کا یہ آخری پرچہ ہے

اور

آئندہ جنوری ۴۸ء کا "نگار"

جوبلی نمبر ہوگا

جس کی قیمت خریداران نگار سے بھی بہر زاید لی جائے گی - یعنی یہ پرچہ ہر شخص کے نام ذریعہ وی، پی بھیجا جائے گا اور اگر آپ کی خریداری دسمبر ۴۷ء یا جنوری ۴۸ء میں ختم ہوتی ہے تو وی، پی چھ روپیہ آٹھ آنے ہوگا ورنہ ڈیڑھ روپیہ کا ـــ اگر خریداری منظور نہیں ہے تو اب بھی وقت ہے کہ آپ ہمیں بواپسی ڈاک مطلع کر دیں، ورنہ بصورت خاموشی وی، پی بھیجا جائے گا اور واپسی میں ہمیں پانچ آنہ کا نقصان ہوگا -

اس پرچہ کی روانگی نمبر خریداری کے لحاظ سے سلسلہ وار ہوگی اس لئے ۱۵ فروری ۴۸ء تک اسکا انتظار کیجئے -

جوبلی نمبر کس قدر اہم چیز ہے اس کا اندازہ آپ کو صفحہ ۲ کے اشتہار سے ہو سکے گا، نیز اس امر سے کہ غیر خریداران نگار سے اس کی قیمت علاوہ محصول تین روپئے مقرر ہے -

منیجر نگار - لکھنؤ

جوبلی نمبر ہر شخص کے نام ذریعہ رجسٹری بھیجا جائیگا اور وی پی میں رجسٹری کے مصارف شامل ہونگے اسلئے اگر آپ چندہ پیشگی بھیجیں تو چھ روپیہ آٹھ آنہ روانہ فرمائیں۔

"نگار" کا جوبلی نمبر

پاکستان نمبر ہوگا

اگر آپ نے کوئی جواب نہ دیا تو آپ کے سکوت کو رضامندی سمجھکر وی پی بھیجا جائے گا

۱۔ لیکن اس میں نہ حصول پاکستان کی تاریخ ہوگی، نہ مسلم لیگ کے جدوجہد کی داستان، کیونکہ اس سے ہر شخص واقف ہے بلکہ پاکستان اور ہندوستان کی تمام مسلم آبادی کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا جائیگا تاکہ مسلمانوں کی یہ جدید آزاد حکومت اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زریں اور اُن کارناموں کو نہ بھول جائے جن پر مسلم حکومتوں کی ترقی کی بنیاد قایم ہوئی تھی۔ گویا بہ لحاظ موضوع یہ

تمدن اسلامی نمبر بھی ہوگا

۲۔ اس نمبر کی ضخامت ۲۵۰ صفحات سے زیادہ ہوگی اور اسکی تیاری میں ہم کو تین ہزار روپیہ زاید صرف کرنا پڑیں گے اس لئے خریداران نگار سے امید ہے کہ وہ اس مخصوص نمبر کے لئے جو کتابی صورت میں ۶۰۰ صفحات کو محیط ہوتا۔ ڈیڑھ روپیہ دینا گوارا فرمائیں گے ہم ان حضرات کے نام جن کا چندہ دسمبر ۴۷ء یا جنوری ۴۸ء میں ختم ہوتا ہے، جنوری ۴۸ء کا نگار ذریعہ وی پی چھ روپیہ آٹھ آنہ میں (معہ مصارف رجسٹری) روانہ کرینگے اور جن کا چندہ ختم نہیں ہوتا انکے نام کا وی پی ڈیڑھ روپیہ میں (معہ مصارف رجسٹری) بھیجا جائے گا۔

تمام مقالات اڈیٹر نگار کے قلم کے ہونگے

حضرت نیاز فتحپور کی ایک بے مثل تصنیف

"من و یزداں"

جو اپنی انشاء عالیہ اور پرزور خطیبانہ تحریر کے لحاظ سے معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتی ہے
اور اخلاقی تعلیمات، کے لحاظ سے اتنی بلند ہے کہ اسے صحیح معنے میں

انجیل انسانیت ——— کہہ سکتے ہیں

اس میں مذاہب کی تخلیق، خدا کے تصور، رسالت کے مفہوم، دینی عقاید اور کتب الہامی کی حقیقت پر، بسیط تاریخی، علمی، نفسیاتی اور اخلاقی بحث کی گئی ہے

یہ کتاب ادبی حیثیت سے بھی اڈیٹر نگار کا وہ کارنامہ ہے جسے ادب و انشاء میں "حرف آخر" کہا جاسکتا ہے۔
حجم ۶۷۲ صفحات۔ کاغذ سفید و دبیز، جلد مضبوط۔ قیمت علاوہ محصول سات روپیہ آٹھ آنے۔ مینیجر نگار۔ لکھنؤ

ملاحظات

ہندوستان کا ہولناک مستقبل

یوں تو قتل و خونریزی کی ابتدا بہت پہلے ہی ہو چکی تھی اور کلکتہ، نواکھالی، بہار اور مغربی یوپی کے بعد لاہور اور مضافات لاہور تک یہ آگ پھیل گئی تھی، لیکن ۱۵ اگست کے بعد جب تقسیم ہند عمل میں آچکی، تو اس نے زیادہ بھیانک شکل اختیار کرلی، یہاں تک کہ ہندوستان کی مرکزی حکومت کا صدر مقام (دہلی) بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔ خیر، دہلی کی قسمت میں تو قتل و خونریزی لکھی ہی ہے۔ اس سے قبل بھی بارہا اس کی گلیوں میں انسانی خون پانی کی طرح بہ چکا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ آیندہ اور کتنی بار اس کو اس نوع کی انسانی درندگی کا شکار ہونا ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کا اثر ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ خراب پڑا۔ پاکستان میں تو یہ کہ وہاں کے لوگوں کو ہندوؤں کی ذہنیت کو مسلم کش ذہنیت ثابت کرنے کا زیادہ موقعہ ملگیا اور ہندوستان میں یہ کہ مسلمانوں کے دل خوف و اندیشے سے بھر گئے اور ان کو یہ خیال پیدا ہو چلا کہ حکومت واقعی اقلیت کی حفاظت نہیں کرنا چاہتی یا کر نہیں سکتی، پھر اگر یہ بات صرف اتنی ہی ہوتی اور یہ جھگڑا محض ہندو مسلم اختلاف کا ہوتا تو بھی غنیمت تھا لیکن اب بات شاید راز نہیں رہی کہ دہلی کی بدامنی ایک ایسی منظم سازش کا نتیجہ تھی جس کا مقصود ہندوستان کی موجودہ حکومت ہی کو معزول کر دینا اور اس کی جگہ خالص ہندو حکومت کو قایم کرنا تھا۔ یہ بات اب کسی سے مخفی نہیں کہ دہلی میں جو کچھ ہوا وہ راشٹر سیوک سنگھ، ہندو مہا سبھا اور سکھوں کے اکالی دل کی منظم سازش تھی جس میں بعض راجپوت ہندو ریاستیں بھی شریک تھیں اور جس کا مقصود موجودہ حکومت اور خصوصیت کے ساتھ پنڈت نہرو کو معزول کر دینا تھا۔ اس کے ثبوت میں ہندو سبھا کے اخبار ہندو اوٹ لک کا وہ بیان پیش کیا جا سکتا ہے، جس نے اس سازش کی طرف اشارہ کیا تھا اور سیوک سنگھ کے اخبار ارگنائزر کا وہ تہدیدی نوٹ جس میں صاف صاف تحریر تھا کہ "پنڈت نہرو اور دوسرے وزراء کا وہی حشر ہوگا جو برما کے وزیروں کا ہوا ہے"۔ اسی کے ساتھ جب ہم جنم بھومی کے خصوصی نامہ نگار کا بیان پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سازش کی جڑیں بہت دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور راجپوتانہ کے رجواڑے حکومت ہند کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنا کر پٹیالہ سے کاٹھیاوار تک راجستھانی حکومت قایم کرنے کی فکر میں تھے۔ الغرض یہ تھی وہ سازش دہلی کے ہنگامہ و فساد کی تہ میں، جس کا علم پنڈت نہرو کو ہو چکا تھا اور انھوں نے اسی لئے بہ لحاظ حفظ ماتقدم مدراس رجمنٹ اور گورکھا فوج کا انتظام کر لیا تھا۔ پھر پنڈت نہرو نے جس دلیری و ہمت سے کام لیا اس کا حال سب کو معلوم ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اگر وہ اس وقت دہلی میں نہ ہوتے، تو شاید مسلمانوں کا کوئی فرد وہاں باقی نہ رہتا اور حکومت اسوقت مہا سبھائیوں کے ہاتھ میں ہوتی یا یہاں سکھستان و راجستھان قایم ہو گیا ہوتا۔

ہر چند اب دہلی میں نسبتاً امن وسکون ہے اور سردار پٹیل بھی بدرجۂ مجبوری راجستھان وسکھستان وغیرہ کا خواب دیکھنے والوں کو متنبہ کر چکے ہیں، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہئے کہ آیندہ کے خطرات کم ہو گئے ہیں، یا مہاسبھائی ذہنیت ختم ہو گئی ہے، وہ برابر بڑھ رہی ہے اور غالباً اسی ارادہ کے ساتھ جس کا اظہار جنرل کری اپا نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ "ہندوستانی فوج دو سال کے اندر پاکستان کو ہندوستان میں شامل کرلے گی"۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ جارحانہ ذہنیت اسی طرح بڑھتی رہی اور ہندوستان کے اکابر کی طرف سے ایسے ہی غیر دانشمندانہ بیانات شایع ہوتے رہے، تو آتش جنگ مشتعل ہو جانا بعید نہیں ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ مہاسبھائیوں کو اپنے مقصد میں آسانی سے کامیابی حاصل نہ ہو جائے گی۔

مانا کہ پاکستان، ہندوستان کے مقابلہ میں ہر لحاظ سے ضعیف ہے، لیکن اگر ان دونوں حکومتوں میں جنگ چھڑ گئی تو یہ صرف پاکستان وہندوستان کی جنگ نہ ہوگی بلکہ ساری دُنیا کی جنگ ہوگی کیونکہ پھر امریکہ اور روس بھی (جن کے درمیان کشیدگی بڑھتی جارہی ہے) خاموش بیٹھے نہ رہیں گے اور یہ دونوں پاکستان پر اپنا اثر قایم کرنے کے لئے بڑی سی بڑی قیمت ادا کرنے پر طیار ہو جائیں گے ۔۔ پاکستان میں اب بھی امریکہ اور اسی کے ساتھ برطانیہ آہستہ آہستہ اپنے اثرات بڑھا رہا ہے جس کو روس اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا کیونکہ کراچی کی بندرگاہ پر عرصہ سے اسکی نگاہ ہے، اس لئے اگر ہندوستان و پاکستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی تو یہ اس قسم کی جنگ نہ ہوگی جیسی اسوقت قبایلی قزاقوں اور ہندوستانی فوجوں کے درمیان کشمیر میں ہو رہی ہے بلکہ یہ بین الاقوامی جنگ ہوگی، ایک عالمگیر جنگ ہوگی، جس میں افغانستان، ایران، مشرق ادنیٰ اور روس و امریکہ سبھی شامل ہوں گے اور اس کا کھلا ہوا نتیجہ ہندوستان کی بربادی ہے ۔۔ اس لئے ملک کی موجودہ نازک حالت مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ ہندوؤں کے لئے بھی خطرہ سے خالی نہیں ہے اور اس خطرہ کو دور کرنے کی صورت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ ہندوستان سے مہاسبھائی ذہنیت اور پاکستان سے مذہبی تنگ نظری دور ہو اور دونوں حکومتیں آیندہ کے پروگرام پر اس نظریہ کو سامنے رکھکر غور کریں کہ ان دونوں حکومتوں کو آپس میں ملکر ترقی کرنا ہے ۔ لیکن اس میں اسی وقت کامیابی ممکن ہے جب ہندوستان کی موجودہ وزارت کے ہاتھ مضبوط کئے جائیں

مسلم لیگ تو اب باقی نہیں اور نہ اسکے باقی رہنے کی کوئی وجہ، اس لئے ہندوستان کے مسلمانوں کو سوچنا ہے کہ انھیں کونسی راہ اختیار کرنا چاہئے ۔ اخیر دسمبر میں بہ صدارت مولانا آزاد لکھنؤ میں مسلمانوں کا بڑا اجتماع ہو رہا ہے جس میں مسلمانوں کی آیندہ سیاسی پوزیشن پر غور کیا جائے گا اور توقع یہی کی جاتی ہے کہ فیصلہ، شرکت کانگرس ہی کے حق میں ہوگا، لیکن ہماری رائے میں یہ مناسب نہ ہوگا کہ وہ کوئی اپنا بلاک الگ بنا کر شریک ہوں، وہ جمعیتہ العلماء ہو یا نیشنلسٹ جماعت، حزب الاحرار ہو، یا جمعیت الانصار، ان سب کو ختم ہو جانا چاہئے اور مسلمانوں کو کانگرس میں مسلمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ باشندۂ ہندوستان کی حیثیت سے شریک ہونا چاہئے، کیونکہ اب سوال جداگانہ انتخاب کا بھی نہیں ہے اور کانگرس کو مہاسبھائیوں کے مقابلہ میں صرف اسی طرح تقویت پہونچ سکتی ہے اور آیندہ انتخاب میں مہاسبھائیوں کو ناکام بنانے کی یہی ایک صورت ہے ۔

بچّوں کی نفسیات

بچّوں کی نفسیات کا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے اور ان لوگوں کو جو بچّوں کا مشاہدہ کرتے ہیں، کچھ خاص قسم کی دشواریوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ بالغ آدمی تو بتا سکتا ہے کہ فلاں حالت میں اس کے دماغ کی یہ حالت ہوتی ہے، یعنی نفسی اصطلاح میں وہ آپ کو اپنے مشاہدۂ نفس سے واقف کرسکتا ہے اور آپ اسکی دماغی خصوصیات کا نسبتاً آسانی سے تجزیہ کرسکتے ہیں لیکن اسکے برعکس بچّہ جانور کی طرح گونگا ہوتا ہے اور اس لئے اس کے نفسی مطالعہ کے لئے مشاہدہ شرط اولین ہے۔

بچّوں کی نفسی و دماغی حالت کا مشاہدہ کرنے کے لئے خاص سلیقہ کی ضرورت ہے۔ بچّوں کے متعلق ڈائری رکھنے والوں میں ڈارون کا شمار اولین لوگوں میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد اکثر لوگوں نے جن میں پریر (Preyer) کا نام بہت مشہور ہے، بچّہ کے پیدائش کے بعد ہی سے اس کی روزانہ حرکات تحریر کی ہیں اور ہر ماں تھوڑی سی تربیت کے بعد بچّہ کے متعلق اس قسم کا اندراج رکھ سکتی ہے۔ یہ اس کے لئے نہ صرف ایک دلچسپ مشغلہ ہوگا بلکہ اس سے بچّہ کی نفسیات کا مطالعہ کرنے کے لئے کافی مواد بھی ہاتھ آجائیگا کہ بچّہ نے کس عمر میں کن حالات کے تحت خارجی اشیا سے دلچسپی لینا شروع کی، اس کی زندگی کے کس دور میں جذبات ظاہر ہوئے اور کس طرح آہستہ آہستہ عقل کا عروج ہوا۔

انسان بھی دوسرے جانوروں کی طرح ماحول اور وراثت کی پیداوار ہے۔ ہر فرد کچھ خاص طبعی رجحانات لیکر پیدا ہوتا ہے، یعنی اچھائی یا برائی کی کچھ خاص صلاحیتیں اس میں ودیعت ہوتی ہیں۔ یہ موروثی میلانات، جب تک مناسب ماحول انکی تکمیل کے لئے نہ ملے، پوشیدہ رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر بیج کو لیجئے کہ اگر زرخیز اور مناسب جگہ میں تخم ریزی کی جائے اور اس کی پوری طرح نگرانی کی جائے تو اس سے پیدا ہونے والا پودا اپنے طبعی قد کو پہونچے گا ورنہ نہیں۔

موافق حالات میں پرورش پانے سے بچّے معیاری آدمی بن جاتے ہیں۔ حالات ناموافق ہونے سے بچّہ صرف ناکارہ ہی نہیں بلکہ ہیئت اجتماعیہ کے لئے ایک خطرناک فرد ثابت ہوسکتا ہے۔ ہر بچّہ میں بگڑنے اور بننے کی صلاحیتیں ہوتی ہیں اسی لئے مناسب تربیت بہت ضروری چیز ہے۔

بچّوں کے دماغ کو سمجھنے کی کوشش اپنی ابتدائی شکل میں قیاس ہی کے ذریعہ سے ہوسکتی ہے۔ نوزائیدہ بچّہ کو اپنے وجود کا بالکل خیال نہیں ہوتا اور اسکا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ وہ خود کو اپنے ماحول سے ممیز کرسکتا ہے وہ کچھ احساسات تو ضرور رکھتا ہے لیکن یہ احساسات اور اعمال اس کی ذات سے وابستہ نہیں ہوتے، البتہ ماحول سے خود کو ممیز کرنے والے احساس کی ترقی کے تمام امکانات اس میں

موجود ہوتے ہیں۔ بچہ جیسے جیسے بڑھتا جاتا ہے اس کو خود اپنے احساسات سے دلچسپی بڑھتی جاتی ہے اور مسرت کو مسرت کی خاطر حاصل کرنے کا رجحان پیدا ہوتا جاتا ہے۔ اسے زندگی کی "خود آسودانہ" (Auto erotic) منزل سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ترقی کی دوسری منزل اس وقت شروع ہوتی ہے جب بچہ اپنے جسم سے دلچسپی لینے لگتا ہے اور اس میں ابتدائی احساس خودی کا پیدا ہو جاتا ہے، مثلاً یہ کہ یہ خوشگوار ہے، یہ ناخوشگوار ہے، مجھے اس کا ذائقہ لذیذ معلوم ہوتا ہے'۔ مجھے اپنی ٹانگ میں درد محسوس ہوتا ہے' اس منزل کو منزل خود پرستی Narcissus یا منزل نرگسی کہا جاتا ہے اس کا یہ نام اس یونانی روایت سے لیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ نرگس خود اپنی صورت پر فریفتہ ہو گئی تھی۔ خارجی دنیا سے دلچسپی کا نمبر بچوں میں سب سے بعد آتا ہے۔ اسے ہم خارجی محبت کی منزل کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ اس منزل میں قدم رکھتے ہی انسانی زندگی غیر معمولی طور پر متاثر ہوتی ہے۔ ابتدائی ایام طفولیت میں بچہ کی رہنمائی اس کا جذبۂ مسرت کرتا ہے اسے اپنے برے بھلے کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ لیکن خارجی محبت کی منزل میں ابتداء ہی سے اس میں خارجی دنیا کو سمجھنے بوجھنے کا مادہ بڑھ جاتا ہے۔ شروع شروع میں بچہ جاندار اور بے جان اشیاء میں تمیز نہیں کر سکتا، وہ ہر شے کو اپنی ذات کے نمونہ پر ڈھالتا ہے اور وہ جاندار یا بے جان چیز کو اپنی طرح کی شخصیت عطا کرتا ہے۔ بچہ اس عمر میں مخالف جنسوں میں تمیز نہیں کر سکتا۔

تجزیۂ نفس کی بہت اہم دریافت جس پر بعض لوگ اعتبار نہیں کرتے یہ ہے کہ بچہ میں جنسی میلان بھی ہوتے ہیں۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جنسی خواہشات سن بلوغ میں پیدا ہوتی ہیں اور چھوٹے بچے جنسی وقوف سے بالکل معرا سمجھے جاتے ہیں، لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ جنسی میلان ایسی چیز نہیں جو بچہ میں دفعتاً پیدا ہو جاتا ہو وہ پیدائشی چیز ہے جو آہستہ آہستہ مسلسل بڑھتی رہتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بچوں کے جنسیاتی مظاہر، بالغوں کے جنسیاتی طریق مظاہر سے مختلف ہوتے ہیں۔ بہت سے ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ بچوں میں انگوٹھا چوسنے کی عادت جو اس قدر عام ہے، وہ اسی جذبۂ جنسی کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ بچے کے جسم کے مختلف اعضاء مثلاً ہونٹ، چوتڑ، بول و براز کے سوراخ اور آلات تناسل میں ایک خاص ذکاوت حس پائی جاتی ہے۔ جسم کے ان اعضاء میں سے جب کسی خاص عضو سے بچہ کو سرور حاصل ہونے لگتا ہے، تو یہ سرور اپنی بڑھی ہوئی شکل میں اس خاص احساس سے مشابہ ہو سکتا ہے جو جوان آدمیوں میں جنسی جذبہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ جنسی مظاہر کا بچوں میں بالکل فقدان ہوتا ہے۔ تجزیۂ نفس ہمیں بتاتا ہے کہ ابتدائی طفلانہ زندگی میں بھی بچہ کی محبت کے تعلقات میں جنسی احساسات شامل ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ والدین بھائی اور بہنوں کی محبت میں بھی جنسی عنصر کارفرما ہوتا ہے بچہ کے بڑے ہوتے پر جب تہذیبی رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں تو جنسی عنصر کو لاشعور میں دبا دیا جاتا ہے اور برادرانہ یا برادرانہ محبت جنسی رنگ و روغن سے معرا ہو کر شعور میں داخل ہوتی ہے۔ بچہ کی جنسی زندگی کا دور، خود آسودانہ، خود پرستانہ اور خارجی محبت کی ارتقائی منازل ختم ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ خود آسودانہ دور میں بچہ کی محبت اپنے جسمانی احساسات تک محدود رہتی ہے۔ نرگسی دور میں وہ اپنے جسم کو نظر محبت سے دیکھتا ہے۔ اپنے ہم جنس سے محبت کرنا یعنی ایک مرد کا

دوسرے مرد سے یا ایک عورت کا دوسری عورت سے محبت کرنا، خود آسودانہ ارتقا کی پہلی منزل ہے۔ جنسیات کی دوسری منزل کے آغاز پر جنس مخالف سے محبت ہونے لگتی ہے۔ ایک مرد عورت سے ہی کیوں محبت کرے، یا ایک عورت مرد سے ہی کیوں اُلفت کی پینگیں بڑھائے، اس قسم کا سوال کرنا صحیح نہیں کیونکہ یہ عین فطرتِ انسانی ہے۔

تجزیۂ نفس اس کے علاوہ ہم کو یہ بھی بتاتا ہے کہ اکثر اعصابی امراض کی ابتدا بچپن کی جنسیاتی ترقی رک جانے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ منزل خود آسودگی میں محبت کے ٹھٹھر کر رہ جانے سے زندگی کا زاویۂ نگاہ مریضانہ ہو جاتا ہے اور تمام مسرتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ نرگسی منزل کے امراض کسی خاص قسم کا خوف خصوصاً موت کا خوف پیدا کر دیتے ہیں۔ اپنے ہم جنس کی محبت میں مداخلت ہو جانے سے اکثر ہسٹریا یا اسی نوع کے دیگر امراض پیدا ہو سکتے ہیں اور جنس مخالف کی محبت میں خلل پڑ جانے سے بھی زندگی کی روانی میں فرق پڑ سکتا ہے۔ بچہ کی ابتدائی جنسی محبت کا مرکز اس کے والدین ہوتے ہیں اور ترقی کی اس منزل پر رک جانے سے فرد اپنے خاندان کے دایرہ سے نکل کر کسی اور سے محبت کرنے کی اہلیت کھو بیٹھتا ہے۔ اپنے آپ کو حقیر سمجھنا، ضرورت سے زیادہ شرمانا اور خطا کا ایک مبہم احساس اس منزل کی خصوصیات ہیں۔ اس طرح آیندہ دماغی زندگی کی ترقی کا دارومدار بچپن کی جنسیاتی زندگی پر ہے۔ فرائیڈ کا خیال ہے کہ بچہ میں ہر قسم کی جنسیاتی گمراہی کے امکانات ہوتے ہیں، لیکن اس کا انحصار بڑی حد تک ماحول پر ہے۔ بچپن کی خرابی بالغ زندگی پر بڑے دور رس نتائج مترتب کرتی ہے اس لئے ہمیں اس بات پر تعجب نہیں کرنا چاہئے کہ انسان کی زندگی کے بناؤ بگاڑ میں جنسیات کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ ——— اپنے وسیع معنوں میں یہ جنسیات ہی کا محور ہے جس کے گرد ہماری تمام سرگرمیاں چکر لگاتی ہیں۔ ہر فرد کا دماغی سکون و اطمینان اس کے گھر اور اس معاہدہ پر منحصر ہے۔ ——— جس کے بموجب اس کی گھریلو اور ازدواجی زندگی کے عناصر مرتب ہوتے ہیں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ جنسی زندگی ہی ازدواجی معاہدہ کو مضبوط بناتی ہے۔ جنسیاتی زنجیر سے صرف والدین ہی بندھے نہیں ہوتے بلکہ بچہ کو بھی لاشعوری جنسی معاہدہ سے سہارا اور مدد ملتی ہے اور یہی جنسی معاہدہ اسے خاندان کے دوسرے افراد سے منسلک کر دیتا ہے۔ بالغ آدمیوں میں جنسیاتی زنجیریں لاشعوری بن جاتی ہیں اسی لئے وہ ہماری نظر سے پوشیدہ رہتی ہیں۔

نظری اور میکانکی تفصیلات میں اُلجھے بغیر اب میں آپ کو مختصراً یہ بتاؤں گا کہ بچہ کی پرورش میں کیا کیا احتیاط برتنی چاہئے۔ بچوں میں باقاعدگی کی عادت پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے۔ بچہ کا منھ اور بول و براز کے سوراخ خاص طور پر ذکی الحس ہوتے ہیں، چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بچہ کو چوسنے میں ایک مسرت آمیز احساس ہوتا ہے اور اگر اسے مقررہ وقفوں کے بعد دودھ نہ پلایا جائے تو وہ انگوٹھا چوس کر خود کو خوش کرنا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ انگوٹھا چوسنا بذات خود اس کی عادت میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ عادت صرف جسمانی ہی طور پر مضر نہیں بلکہ دماغ پر بھی اس کا خراب اثر پڑتا ہے۔ بچہ کی صفائی کے ساتھ یہ خیال بھی رکھا جائے کہ اس کے جسم کے حساس اجزا پر بار بار ہاتھ نہ پھرے۔ ابتدائی عمر ہی سے بچہ میں اکیلے رہنے اور تھوڑی بہت دیر اندھیرے میں رہنے کی عادت ڈالنی چاہئے۔ اسے خوب بھینچ بھینچ کر جوش و اشتیاق کے ساتھ پیار نہ کرنا چاہئے۔ ماں اور باپ دونوں

جہاں تک ہو سکے، اسے برابر برابر پیار کریں اور اسی طرح اسے دونوں سے محبت کرنے کا موقع دیا جائے۔ والدین میں سے کسی ایک طرف سے نامناسب محبت کا اظہار بچہ کی دماغی صحت کے لئے مفید نہیں ہوتا۔ یک طرفہ اثرات سخت مضر ثابت ہوتے ہیں۔ بچہ کو نہ تو یہ سمجھنے کا موقع دیا جائے کہ اس کا ہر مطالبہ پورا ہو سکتا ہے اور نہ اس کے ہر مطالبہ کو نظر انداز کیا جائے۔ اکثر اکلوتے، سب سے بڑے یا سب سے چھوٹے یا ایسے بچوں کو جو اکثر بیمار رہتے ہیں، من مانے کام کرنے دئے جاتے ہیں، ایسے ہی بچے بڑے ہو کر دماغی توازن کھو بیٹھتے ہیں۔ بچہ کو اپنے بہن بھائی اور دیگر بچوں سے ملنے جلنے دیا جائے۔ باہر والوں سے مانوس ہونے میں حتی الامکان اس کی ہمت افزائی کرنا چاہئے۔ بچہ کے شوق تحقیق کو روکنا نہیں چاہئے اور نہ اس کے تکلیف دہ سوالات نظر انداز کرنا چاہئے۔ تجزیۂ نفس ہمیں بتاتا ہے کہ بچوں کو پیدائش وغیرہ کے متعلق غلط معلومات بہم پہونچانے سے کتنا خطرناک نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ بچے اور والدین کو ایک دوسرے پر مکمل اعتماد ہونا چاہئے تاکہ جب بچہ کوئی بات جاننا چاہے تو وہ خود بخود اپنے ماں باپ سے معلوم کر سکے۔ جب اس کی عمر ایک سال سے زیادہ ہو جائے تو اسے والدین کے ساتھ ایک ہی بستر پر نہیں سلانا چاہئے، دو تین سال کی عمر ہو جانے پر بچہ کو بالکل علیحدہ کمرہ میں سلانا بہتر ہوگا۔ بچہ کی خواہشات اور ضروریات کا بغور مطالعہ کیا جائے اور انکے کھیل اور تفریحات کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ وہ ان سے پوری طرح مطمئن ہو سکیں۔ بچہ کے میلانات کا مشاہدہ کرنے پر پتہ چلے گا کہ اس کے اکثر میلانات ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ اپنے والدین سے محبت کرنا چاہتا ہے اور انکی محبت کا بھی طالب ہوتا ہے۔ کبھی یہ اپنے ساتھ کھیلنے والے بچوں کی رہنمائی کرنا چاہتا ہے اور کبھی خود ان کی رہنمائی پسند کرتا ہے۔ اس نوع کے متضاد میلانات کی تسکین کے لئے اس کی حتی الوسع امداد کرنی چاہئے۔ میری رائے میں کسی انسان کی نفسی صحت بڑی حد تک ان ہی تناقضات سے محظوظ ہونے کی صلاحیت پر منحصر ہے۔ بچہ کی صحیح تعلیم کے لئے محبت آمیز فضا بہت ضروری ہے بچہ جس سے محبت کرتا ہے اس کی نقل اتارتا ہے اور اس کے محبوب کا نصب العین اس کی دلچسپی کا مرکز بن جاتا ہے۔ ایک معلم جو اپنے متعلم میں محبت کی روح پھونک سکتا ہے اس معلم کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔

جس میں اس وصف کی کمی ہو۔ بچوں کی تعلیم کے لئے وقتاً فوقتاً متعدد طریقے ایجاد کئے گئے۔ یہ طریقے اسوقت تک مقبول رہے جب تک کہ ان کا موجد خود ان پر عمل کرتا رہا لیکن جونہی ان پر کسی باہر والے نے عمل کیا ان کی افادیت ختم ہو گئی۔ موجد کی شخصیت اور انہماک نے اس کے طریقۂ تعلیم کو کامیاب بنایا تھا۔ وہ معلم جس کی متعلمین عزت اور محبت نہیں کرتے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اب میں اس سلسلہ میں کچھ ہدایت کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ تجزیۂ نفس کے ذریعہ دماغ کی تمام خرابیوں کا علاج کیا جا سکتا ہے، دماغ کے ان امراض میں جو عضوی خرابیوں سے پیدا ہوتے ہیں، خالص دماغی علاج سے کچھ فایدہ نہیں ہوتا، مثلاً جب غدۂ درقیہ کے عمل میں خرابی آجاتی ہے تو دماغی اور جسمانی ترقی رک جاتی ہے۔ درقیہ (جانوروں کے غدود سے طیار ہونے والی دوا) ایسے مرضوں پر اکسیر کا کام کرتی ہے۔ اسی طرح جب کسی بچہ کے دماغ میں پیدائشی خرابی ہوتی ہے تو بھی

علاج کا کوئی فایدہ نہیں ہوتا۔ بچّہ کی بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ بچّہ کی ذہانت میں ایک مقررہ حد کے بعد کوئی اضافہ نہیں ہوتا اور تعلیمی ذرائع بیکار ثابت ہوتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں اب اس کی اہمیت تسلیم کرلی گئی ہے کہ بچّہ کا کبھی کبھی جسمانی معائنہ کراتے رہنا چاہیئے اور بہت سے ممالک کے اسکولوں میں طبّی معائنہ کیا جاتا ہے، لیکن دماغی معائنہ کی ضرورت ابھی تک تسلیم نہیں کی گئی۔ بچّہ کی ترقی کے لئے دماغی صحت جسمانی صحت سے کم ضروری نہیں۔ بدقسمتی سے بہت سے اطبا نفسیاتی اجزا کے متعلق بہت واضح تصور نہیں رکھتے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ توانا جسم میں توانا دماغ ہوتا ہے، یہ صحیح نہیں۔ جسمانی طور پر توانا آدمی دماغی طور پر مریض ہوسکتا ہے اکثر حالتوں میں دماغ کے جداگانہ علاج کی ضرورت ہوتی ہے۔ عصر حاضر میں بچّوں کے دماغی علاج کی سہولتیں بہم نہیں پہونچائی جاتیں۔ جسمانی معائنہ کی طرح بچّہ کے نفسیاتی معائنہ کی بھی ازحد ضرورت ہے اور خصوصاً اس وقت جب بچّہ میں کوئی دماغی انوکھاپن ظاہر ہو تو اس کا نفسی معائنہ فوراً نہ کرانا چاہیئے۔ دماغی تکلیف اکثر جسمانی تکلیف کے مقابلہ میں زیادہ شدید اور خطرناک ہوتی ہے اور ہمیں دماغی مریضوں کی امداد میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھنا چاہیئے۔ (ترجمہ) محمد عظیم

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

منجملہ ۱۲۴ عنوانات کے چند خاص عنوان ملاحظہ ہوں:-

فحاشی کی تعریف اور اسکی ابتدا ـــــ شادی، طلاق و خلع۔
مذہبی فحاشیاں ـــــ فحاشی پر عمومی تبصرہ۔
فحاشی قرون وسطیٰ میں ـــــ عہد جدید اور فحاشی۔
اخلاق جنسی ـــ غیر فطری فحاشیاں مثلاً:- استلذاذ بالمثل۔
استلذاذ بالنفس ـــــ استلذاذ بالوحوش۔

جنسی میلانات اور شہوانی خواہشوں پر اتنا جامع تاریخی، علمی و نفسیاتی تجزیہ آپ کو کہیں اور نظر نہ آئے گا، حضرت نیاز کی سالہا سال کی تحقیق و جستجو کا نتیجہ ہے اور اُردو میں سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر یہی ہے

حجم ۱۶۰ صفحات ـــــ کاغذ سفید و دبیز ـــ قیمت علاوہ محصول چار روپے

منیجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ

انشاء اللہ خاں کی مثنویاں

اُردو میں انشاؔ کی کوئی طویل مثنوی نہیں ملتی، چھوٹی چھوٹی مثنویاں ہیں جن میں سے اکثر مضامین ہجو پر مشتمل ہیں۔ کھٹملوں مکھیوں، مچھروں اور بھڑوں کی ہجو میں جو مثنویاں لکھی ہیں وہ قریب قریب مولانا حالی کے پیش کردہ مثنوی پر پوری اُترتی ہیں۔ کیونکہ ان میں ربط بھی ہے، مقتضائے حال کی پابندی بھی ہے اور مافوق الفطرت عنصر بھی مفقود ہے البتہ "گیان چند ساہوکار کی ہجو" اور "چنچل پیاری ہتھنی" کی کہانی کے مضامین بہت رکیک ہیں ان دونوں مثنویوں میں سے پہلی مثنوی سوداؔ کی بیشتر مثنویوں کی یاد دلاتی ہے۔

"کھٹملوں کی ہجو" میں چھیانوے اشعار ہیں، ان میں انشاؔ نے تشبیہ و استعارے کا کمال دکھایا ہے، چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں:

کچھ یہ کھٹمل پڑے ہیں اب کی سال، کہ ہوئی سب زمین لالوں لال
چھا گئے ہیں جو سارے یہ بدبخت، شاخ مرجاں بنے تمام درخت
گھسی ایک ان کی جابجا لڑ ہے میخ جو ہے سو مونگے کی جڑ ہے
ہو گئے سُرخ بید سارے سرد لال مرغے بنے تمام تدرو
بسکہ جاکر جمے قطار قطار ہو گئی لالہ نرگسِ بیمار،
دشت اور کوہ پر کیا جو دخل نخل یاقوت بن گئے سب نخل
ان لعینوں کا یہ سہاگ ہوا تھا جہاں سبزہ لال ساگ ہوا

کھٹملوں کی ہجو میں انشاؔ کی طرح مصحفی نے بھی زبان کھولی ہے فرماتے ہیں:-

کھٹملوں کی زبسکہ ہے افراط تلخ ہے ان سے اپنا خواب نشاط
کافروں نے یہ سر اُٹھایا ہے سارے پنڈے کو توڑ کھایا ہے
کیا کہوں ان گزندوں کی زشتی کر مجھے کر دیا ہے خارشتی،
ہے پھُنکی آگ سی بدن میں تمام پڑ گئے ہیں دو ورڑے تن میں تمام
دم بدم کروٹیں بدلتا ہوں، ادھر اُدھر پڑا اُچھلتا ہوں

پائینچے میں کبھی گھس آتے ہیں کبھی نیفے میں سرسراتے ہیں
اک خلش ساری رات ازار میں ہے آنکھ بند اور ہاتھ ازار میں ہے

مصحفی نے سیدھے سادے الفاظ میں وہ تمام واردات بیان کی ہے جو درحقیقت اس شخص کو پیش آتی ہے جسکے بستر و پلنگ میں کھٹمل موجود ہوں لیکن انشاء نے اپنی شاعری کا فن بھی دکھایا ہے۔ مصحفی نے اپنی اسی نظم میں ایک مقام پر کھٹملوں کو راون کی اولاد کہا ہے۔ اس سے زیادہ آگے نہیں چلے۔ لیکن انشاء نے اپنی نظم میں اس دانہ سے خرمن پیدا کیا ہے، دونوں کے اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

مصحفی ان کی کثرت تعداد سے پریشان ہوکر کہتے ہیں :۔

کوئی کیونکر کرے انھوں کا شمار پیدا ہوتے ہیں ایک سے ۔ ہزار
ہے بجا بسکہ ہیں زمیں پہ زیاد کہئے راون کی ان کو گر اولاد

انشاء کہتے ہیں :۔

کہتے تھے لالہ دیو کی نندن پٹیاں بن گئیں رکت چندن،
بان ارجن کے بن گئے سب بان اور اودھائنوں نے کھائے پان
کبھی ان کی جو کچھ شکایت کی، ایک پنڈت نے یوں روایت کی
ایک راون کے پوت تھا جیمل اس کی اولاد ہیں یہ سب کھٹمل
کیوں نہ دیں چار پائی پہ ڈنکا چھن گئی ان کی سونے کی لنکا،
راجپسوں کی سی کیوں نہ باندھیں ساکھ ایک سے ہوتے ہیں یہ نوے لاکھ
کیوں نہ ہر فرد ہو وے غیرت دار قوم کے اپنے یہ بھی ہیں سردار
لاکھوں پلتے ہیں مارے جاتے ہیں پھر وہی ریلا کرکے آتے ہیں،

اس کے بعد کچھ اشعار ہیں جن کے بعد انشاء گریز کرتے ہیں، شاید مصحفی کے لفظ "زیاد" نے ان کے خیال کو مہمیز کیا ملاحظہ فرمائیے :۔

جھوٹ پنڈت کی وہ روایت ہے دو جنوں کی سی ایک حکایت ہے
پر یہی جانتے ہیں اہل یقین ہیں یہ سارے لعین ابن لعین
یا تو ہیں یزید کی اولاد یا کہ بے شبہ نسل ابن زیاد
جوں جوں مرتے ہیں بڑھتے جاتے ہیں اور لوگوں کو توڑے کھاتے ہیں
کام ہے ان کے ہی مریدوں کا ڈھیر جو گنج ہے شہیدوں کا،

ایسی ہے کھٹملوں کی آئی فوج، کہ سمندر سے جیسے اُٹھے موج
ہوئے یکبار ہاتھی گھوڑے سرخ اور سواروں کے سارے جوڑے سرخ

میر تقی نے بھی کھٹملوں کی شکایت میں زبانِ قلم کھولی ہے۔ ان کی نظم کے بھی چند اشعار یہاں پیش کرنا بے موقع نہیں ہوگا:۔

جنس اعلیٰ کوئی کھٹولا کھاٹ پائے پٹی رہے ہیں جن کے پھاٹ
کھٹملوں سے سیاہ ہے سو بھی چین پڑتا نہیں ہے شب کو بھی
شب بچھونا جو میں بچھاتا ہوں، سر پہ روزِ سیاہ لاتا ہوں،
کیڑا ایک ایک پھر مکوڑا ہے، سانجھ سے کھانے ہی وہ دوڑا ہے
ایک چٹکی میں ایک چھنگلی پر،، ایک انگوٹھا دکھاوے اُنگلی پر
گرچہ بہتوں کو میں مسل ڈالا پر مجھے کھٹملوں نے مل مارا،
سلتے راتوں کو گھس گئیں پوریں ناخنوں کی ہیں لال سب کوریں
ہاتھ تکیہ پہ گہہ بچھونے پر کبھو چادر کے کونہ کونہ پر،
سیکڑوں ایک چارپائی میں، ایک ہتھیلی میں ایک گھائی میں
ہاتھ کو چین ہو تو کچھ کہئے، کب تلک یوں ٹٹولتے رہئے

میر کا آخری شعر مصحفی کے آخری شعر سے ملا کر دیکھئے مضمون قریب قریب ایک ہی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ مصحفی نے زیادہ واضح کر دیا ہے۔ تینوں شاعروں کا کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب پر تو درحقیقت یہ واردات گزری جس نے ان سے کھٹملوں کی ہجو کہلا کر چھوڑا۔ مصحفی نے میر صاحب کے تتبع میں طبع آزمائی کی اور مضمون کے ساتھ ہی ساتھ زبان و بیان میں بھی پیروی کی۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے مصحفی کو دیکھ کر انشاء کا بھی دل للچایا کہ کھٹملوں کی برائی کیجائے؛ چنانچہ انشاء کی مثنوی سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اپنے پر گزری ہوئی کوئی واردات بیان کر رہے ہیں بلکہ اپنے مذاق کے مطابق ایک مضمون ان کے ہاتھ آگیا جسے لے اُڑے اور شاعری کا کمال دکھا گئے۔

انشاء کی دیگر ہجویہ مثنویات بھی قریب قریب اسی طرز اور شاعرانہ جودت کی حامل ہیں جو مذکورۂ بالا مثنوی میں پائی جاتی ہیں "مثنوی در ہجو ننھو" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

ان مچھروں نے کیا یہ اب کی قہر کہ ہوا زرہ پوش سارا شہر
دیکھئے ان کی ٹک جواں مردی سب پر ایک اپنی پھیردی زردی
موی کی زرد زرد پھلیاں ہیں یا گل اشرفی کی کلیاں ہیں،

مولسریوں کی نیچے دیکھے جب — کھرنیاں سی بکھر رہی ہیں سب
جا کے کوٹھوں کی کوئی دیکھے بہار — زرد چمیلی کے پڑے ہیں ہار
اُڑ گئی وہ سفیدی اور اودی — اب جدھر دیکھو زرد داؤدی
پھر جو شاخوں سے ہر شجر کے اُڑے — تو املتاس ہے کہ پھول جھڑے
ساری دیواروں پر قطار قطار — زرد مرچوں کے سوکھتے ہیں ہار
یہاں جو فوارے اب اُچھلتے ہیں — سونے کی ٹڈیاں اُگلتے ہیں
اب جو خشکہ کوئی پکاتا ہے — سو مزعفر پلاؤ کھاتا ہے
ہو کے بیخ ان بھڑوں کی آئینہ — بن گئی ٹھیک ٹھاک خاگینہ
چاندنی کا جو پھول تازہ ہے — سو وہ اک نرگسی دو پیازہ ہے
زرد رو کاسۂ شراب ہوئے — سب مگر نرگسی کباب ہوئے

انشاء نے ایک ہی مضمون کو مختلف پیرایوں سے باندھا ہے اور تشبیہات کا جو کمال دکھایا ہے وہ اپنی آپ مثال ہے۔ "مثنوی در ہجو پشہ" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

مچھروں کو ہوا ہے اب کی اوج — دب گئی جن سے مرہٹوں کی فوج
سوکھے سہمے ہیں کالے کالے ہیں — یہ بھی پر کوئی گھوڑے والے ہیں
بس کہ لپٹے ہی رہتے ہیں ہر دم — حبشی ہو گیا ہے اک عالم
چاٹ لی صاف گلدموں کی دم — رہ گئیں رہ بچاریاں گم سم
بس کہ کافر لپٹ لپٹ جو موئے — تختے صندل کے آبنوس ہوئے
ہوئے مچھر بہت سے جو ساتھی — بنے جتنے بچھے تھے ہاتھی
لوگ بجلی کی طرح ہیں بیکل — چھا گئے مچھروں کے دل بادل
کیچوے تھے سو کالے ناگ بنے — شعلہ منھ سے نکال آگ بنے
اب یہ کیا قہر اے الٰہ ہوا — خون دنیا کا سب سیاہ ہوا
ہر بن مو کی لے چکے ہیں فصد — اور کیا جانے ان کا کیا ہے قصد
بس جدھر دیکھو ان کو ہے اک راہ — نکلے ہے سب کے دل سے دود سیاہ
خال رخسار نازنیں ہیں یہ — مگس شیر و انگبیں ہیں یہ
وہ کچھ زور ہے بچا ہیں یہ — یعنی زمرود کے چھپا ہیں یہ

آگے کیا لکھے کوئی ان کا بھید
پڑ گئے کاغذوں میں لاکھوں چھید

آ کے مچھر جو پھر دو چار ہوئے
حرف بے نقطہ نقطہ دار ہوئے

الغرض قوم یہ بہت بد ہے
نام دیکھو تو کیا مشدد ہے

کھانے پینے میں سب دخیل ہوئے
آگے پشہ تھے اب تو فیل ہوئے

سونڈھیں ہیں مثل فیل ان کے پاس
کیوں نہ کھو دیویں سب کے ہوش و حواس

نہیں مچھر یہ فیل خانہ ہے،
کجری بن ان سے سب زمانہ ہے

کن نے رکھا ہے مچھر ان کا نام
ان کو کہئے تو کہئے لشکر شام

"مثنوی در ہجو مگس" کے چند اشعار بھی دیکھ لیجئے:

مکھیاں اب کی یہ بڑھیں بے ڈول
کہ لگا آ کے ایک جی کو ہول،

کس طرح ہو بہار تازہ دماغ
کرتے ہیں آبشار استفراغ

جان کر مکھیوں کو جنس وغل،
سونگھتے ہیں گل اپنی اپنی بغل

لگی یوں کرنے پھول پہ بھن بھن
جس طرح آ چڑھے کسی پہ جن

تاک جتنے تھے یہ ہوئے مبہوت
جس طرح آ چڑھے کسی پر بھوت

مکھیوں کا ہی کارخانہ ہوا
حبشستان سب زمانہ ہوا،

یہ جو دنیا سواد اعظم ہے
اوڑھے اک کالی جا جسم ہے

مکھیوں کا بلند پایہ ہوا،
سایہ سب ان کے زیر سایہ ہوا

قلقل مے کی اڑ گئی وہ ہوا
چائے سے آ کے مل گیا بتھوا

طاق پر ہے دھرا جو شیشۂ مے
لکھی ہے اس کے بھی نصیب میں قے

دیکھ ان کے پروں کی ایک جھلک
مگسی ہو گیا یہ اسپ فلک،

کھلکھلا کر انار جو ہیں ہنسا،
دام میں مکھیوں کی آن پھنسا

اس کی وہ لال لال بتیسی
نہ لگی کافروں کی جو چیسی،

لے کے دانتوں کو سب سیاہ کیا
اور ہونٹوں کو سب تباہ کیا

ایک لکھوٹا سا جم گیا بس خیر
باغ میں یہ ہوئی عجائب سیر

ایک ذرا اس کو کیجئے آپ نگاہ
کس طرح کی دھڑی جمائی ہے

منہ میں مکھی نے ٹھونس دی مستی
کون ایسی بھلا ہو چھتیسی،

مندرجۂ بالا اشعار کے مطالعہ سے واضح ہو گیا ہو گا کہ جہاں مثنوی کے قواعد کی پابندی انشاؔ نے ملحوظ رکھی ہے وہاں شاعری کے زیور مثلاً تشبیہ، استعارہ، حسن تعلیل اور مضمون آفرینی وغیرہ سے بھی خوش اسلوبی سے کام لیا ہے۔ بے محل نہ ہو گا اگر چند اشعار مصحفی، میر حسن اور میر تقی کی بعض مثنویات میں سے بھی پیش کئے جائیں ؟

انشاؔ نے علٰحدہ علٰحدہ ایذا رساں جانوروں کی ہجو کہی ہے لیکن متذکرہ بالا ہر سہ شعراء نے اپنے مسکونہ مکانات کی ہجو کے سلسلہ میں اس قسم کے حشرات الارض کو بھی لے ڈالا ہے پہلے مصحفی کی شکایت سنئے :

دل کو کاوش ہی رات اور دن ہے — بسکہ پشوں کی اس میں بھن بھن ہے
الغرض اس میں مجھ کو ہر صورت — رہتی ہے موذیات سے صحبت
کبھی چیونٹی بدن کو کاٹے ہے — کبھی دیمک ہی پائے چاٹے ہے
چارپائی جو ہے ہمارے پاس — کھٹملوں کی رہے ہے اس میں مواس
گھونس نے کر دی ہے زمیں سوراخ — موشک کور پر ہے عرصہ فراخ
گر نظر جائے جانب دیوار، — نظر آتی ہے چیونٹیوں کی دیوار
گھن نے پایوں کے تئیں جو ہے چاٹا — خوردہ اس کا چنے کا ہے آٹا

میر حسن صاحب کا شکوہ بھی ملاحظہ فرمائیے چیونٹیوں نے ان کا ناک میں دم کر دیا تھا :

نہ تو بچھو نہ کھٹمل اور نہ مار، — مور نے سب کو کر دیا مسمار
اپنی بانی پہ جب یہ آتی ہے — بوٹیاں توڑ توڑ کھاتی ہے
مردم آزاری پر جو باندھی کمر — تو نکالے ہیں چیونٹیوں نے پر
دیکھکر ہم کو اس جگہ پہ نحیف — پہلوانی کرے ہے مور ضعیف
رات دن ہم سے یہ بگڑتی ہیں — مورچہ باندھ باندھ لڑتی ہیں،

میر تقی میر چھپنگروں اور مکڑیوں سے نالاں ہیں اور اپنی مصیبت کا رونا اس طرح روتے ہیں :-

پھونس کچھ ہے کہیں سو آٹا ہے — بانس کو چھپنگروں نے چاٹا ہے
اُڑ گئی گھاس مٹی ہے دالا — ہے جو بندھن سو مکڑی کا جالا

انشاؔ کی عاشقانہ اُردو مثنوی میں کوئی ندرت نہیں ہے بہر حال کہیں کہیں سے اس کے بھی چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں زمانہ نافرجام کی شکایت دیکھئے :-

کروں کیا جور گردوں کی شکایت — جہاں دیکھو اسی کی ہے حکایت
نہیں یہ دیکھ سکتا خانہ آباد، — کہ ہو کوئی کسی ڈھب سے کہیں شاد

ستائے بن ہمیں کیا کام اس کو — کہاں بن دکھ دئے آرام اس کو
نہیں معلوم منظور اس کو کیا ہے — بُری چتون سے کافر دیکھتا ہے
کمر بس ظلم پر اس نے ہے باندھی — یہ ظالم ہے اُڑا دینے کو آندھی

ساقی سے اس طرح خطاب کیا ہے :

شراب تند دے ایسی ہی ساقی — کہ جس سے غم رہے مطلق نہ باقی
گلابی لاکے رکھ دے وہ مرے پاس — کہ ہو دلہن پنے کی جس میں بو باس
چمک جاوے جو میرا جوہر عقل — تو میں تجھ سے حکایت اک کروں نقل

عاشق و معشوق کی پہلی ملاقات اور محبوبہ کے حسن کا بیان اس طرح کیا ہے :-

گئی آنکھوں تلے بجلی سی اک کوند — سمند ناز نے ڈالا اسے روند
کہا دل نے مرے دیکھی جو وہ مانگ — کہ ہے یہ رات آدھی کچھ دُعا مانگ
حواس و ہوش میرے ہو گئے تار — ہوا میں مانگ چوٹی میں گرفتار
بہم آنکھوں سے آنکھیں لڑ گئیں خیر — عجائب نرگستاں کی ہوئی سیر
وہ شوخ و شنگ دیدہ اس پرن کے — کہ ہو جس طرح دو بچے ہرن کے
نظر آیا وہ کھڑا سیب کا سا — بندھا یاں ڈول کچھ آسیب کا سا
یہ رخساروں میں اسکے فربہی تھی — ہوئی جس سے خجل اکثر بہی تھی
نگاہ مست تھی ایسی ہی بیباک — کہ بس دیکھے جدھر باندھے ادھر تاک
کہوں اس کی جبیں کو کس طرح چاند — کہ اس سے لاکھ حصہ ماندھتا چاند
سہانا تھا کچھ ایسا روپ اس کا — کہ سایہ چاہتی تھی دھوپ اس کا
جٹی دونوں بھویں یہ داد بیداد — کہ ہو دلچسپ جیسے شعر اُستاد
کروں کچھ بھی جو تعریف دُرگوش — تو اُڑ جاویں صدف کے سنتے ہی ہوش
گلاوٹ بازوؤں کی چشم بد دور — وہ دونوں مچھلیاں جیسی سفنقور
نہ کیونکر اس کے خود بینی ہو ایسی — کہیں دیکھی بھی ہے بینی ہو ایسی
پھڑک نتھنوں کی پھر ایسی ہی اچھی — تڑپ جوں تیرنے میں جائے مچھلی
یقیں ہو اس کو جو دیکھے وہ پستاں — کہ بے شک یہ ارم کا ہے گلستاں
بنے دو برج سونے کے یہاں ہیں — کسوٹی کے کلس ان پر عیاں ہیں،

غلط فہمی تھی کہنا یہ بڑی بات
عبث ضایع ہوئی ناحق کو اوقات

یہ کہنا تھا کہ دو سونے کے تھالے
لگائے آنکھ جن پر تھے اُچکے،

نہ جی الماس اور نیلم کے کنے
بہم چھوٹے بڑے تھے یا اکنے

زلیں تھا صاف سینہ پیٹ بھی صاف
بدن آئینہ ساں برّاق شفاف

شکم پر رونگٹوں کا ذکر کیا تھا
فقط وہ عکس خوبی کا پڑا تھا،

ستارہ سی دہکتی تھی پڑی ناف
بھلا کوئی کرے کیا اس کا اوصاف

وہی تو حسن کے چشمے کی تھی سوت
نہ تھی وہ ناف تھی ایک جاگتی جوت

یہی کہتی تھی اس کو دخترِ رز
کہ ہے یہ تو لبِ نہ ہائے ہو

کروں کچھ اور اعضا کا تو کیا ذکر
کہ ناحق کی اتنی ہے کہاں فکر

کہے دو شعر لیکن فارسی ہیں
کہ سچ مچ حسن کے وہ آرسی ہیں

زہے مضمون کی عالی دماغی
چڑھا دیں بلبلیں جن کو چراغی

مپرس از بندِ شلوار از دگر ہیچ
حکایتہاست اینجا بیچ در بیچ،

بناف داں گرہ کن چشم خود باز
کہ زیرِ ہر گرہ دارد ہزار ناز

اسی میں آ گئے مضمون سارے
لگے ہر سمت سے ہونے اشارے

مندرجۂ بالا اشعار سے واضح ہے کہ اس میں لکھنویت حد درجہ غالب ہے۔ رعایت لفظی کی بھرمار اس امر کی طرف خاص طور پر اشارہ کر رہی ہے کہ "گلزار نسیم" کے لئے زمین اسی زمانہ میں طیار ہونا شروع ہو گئی تھی۔

اُردو میں ایک اور مختصر مثنوی "مرغنامہ" کے نام سے ہے اس میں مرغ بازی کی شاد صفت کی گئی ہے لیکن وہی اپنے طبعی تمسخر کے ساتھ تمام مثنوی رعایات لفظی سے پر ہے۔ چند نمونے پیش ہیں:

حمد

حمد ہے فرض اس کی وقت سحر
جس نے کاٹے ہیں مرغ روح کے پر

تن کے کھانچہ میں کر دیا ہے بند
کہ وہ یک چند واں رہے خورسند

نعت

کر ثنائے رسول راہ نما،
جس کی نعلین کا ہے سایہ ہما

صلوٰۃ اس پہ بھیجئے جا و بیہ
ہے جو اک آسماں پہ مرغ سفید

گر حمایت کرے نہ اس کی آل
نہ ہمیں مرغ عقل کے ہیں بال

مُرغوں کی تعریف

مثلِ فولاد مُرغ ہیں اپنے — داد بیداد مرغ ہیں اپنے
پہلوانوں کی ہیں انھوں میں صفات — لات وعزا کو توڑے انکی لات
پاس اپنے جو مرغ ہے جاوا — ہے وہ اسفند یار کا بادا

فارسی زبان میں انشاء کی تین مثنویاں قابل ذکر ہیں (۱) مثنوی شیر برنج (۲) مثنوی شکارنامہ اور (۳) مثنوی بے نقط پہلی مثنوی متصوفانہ ہے جس میں مثنوی مولوی معنوی کا تتبع کیا ہے۔ وہی بحر ہے اور اسی طرح حکایات و امثلہ سے بھی [illegible] گیا ہے مولوی محمد حسین آزاد نے اس مثنوی کے بارہ میں لکھا ہے۔ "نہیں معلوم ہوتا کہ تمسخر کرتے ہیں یا تتبع کرتے ہیں کیونکہ زبان کس فقط روزمرہ ہے کہیں عالم جبروت ولاہوت سے پرے کے الفاظ لاکر لفاظی کرتے ہیں اور جابجا عربی زبان کے کہیں شعر کہیں مصرع ہوتے جاتے ہیں مضامین فقط ظرافت کی باتیں اور حکایتیں ہیں۔ انھیں نظم کر کے معرفت و طریقت میں [illegible] ہیں، کھیر میں نون ڈال کر تصوف کو تمسخر کر دیا ہے"۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مثنوی کے اشعار بعض مرقعات سے پیش کر دئے جائیں۔ فلسفیوں اور منطقیوں کو نصیحت فرماتے ہیں:

تا بکے باشی چنیں زار و زبوں — علم میخوانی پئے دنیائے دوں
از مقولات آوری تا کے سخن — اے حکیم از بحر خود فکری بکن
بدتر از مشکل ہماری اے عبوس — قید خواہی گفت از شکل عروس
ز اہل اشراق آوری تا کے دلیل — چند مشائیں صفت باشی ذلیل
چیست از بعد مجرد حاصلت — میشود آخر جہنم منزلت،
پیچ از صغرا و از کبریٰ مخواں، — از نتیجہ خواہی آمد در فغاں
از دلیل انی دلمے چہ سود — تب و قل الحمد للہ الودود،
از ہیولا عقدۂ نکشایدت — شوق و ذوق ابطال خبر سنجایدت
آخر ایں تفکیک اجزائے رجا — آسیا سامی کند فخر ترا،
ایہا المسجون فی قید الذلل، — لاتقف وامکن علی راس الجبل
رند مشرب باش و عاشق پیشہ شو — فارغ از افکار و از اندیشہ شو

ایک جگہ اور اس طرح پند و عظمت کے دریا بہائے ہیں:-

لیک گستردی بسان عنکبوت — دام تلبیس از پئے تحصیل قوت
تار و پود ہستیت بگستنی است — ایں زمان صید گیری اندکے است

بس نگہا طمعہ گردیدہ است — دل ضعیفاں راز تو رنجیدہ است
تا کجا ایں سعی بیجا بہر صید — ایں تکبر تا کجا ایں مکر و شید
تا کجا باشی میان مزبلہ — بہر شیطاں ورد خود کن ہو قلہ
قل ہو اللہ احد آغاز کن، — ذکر الا اللہ را دمساز کن

ایک اور مقام سے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں :-

خویش را در فکر رازق سازگم — خواندہ باشی فی السماء رزقکم
گفت خود روزی رسانِ انس و جاں — رزقہاء مقسوم شد در آسماں
ایں کفالت را نگر اے ذوفنون — واو عطف آورد بر ما توعدون
ماء موصول انچہ باشد فارسیش — سرسری آنرا بداں در زعم خویش
جامعیت لاحق اینمیعنی است — گر نہ فہمی دائے بر ایں فکری است
حمد شی راحاوی است ایں لفظ ہا — از فیوض او بود نشو و نما،
جملہ افعال و صفاتت اے پسر — شد مقدر بہر تو از خیر و شر
بہرۂ داری گر از ترکیب نحو، — خویشتن را خود مکن در ہو محو
تا برویت منکشف ایں پردہ شد — میرسد چیزے کہ وعدہ کردہ شد
پس چہ باشد حاصل از سعی و تلاش، — خود بفہم اے نکتہ فہم خوش معاش،
من بفرماں خدائے خود شام — فای تعقیب است پس دادستم
قصہ آنرا شنیدی کو مدام — ذکر ما ابلیس خواندے صبح و شام
چلہ تا بگذشت شیطاں شد پدید — با عصا و جبہ درویش سفید
گفت اے شخص انچہ گوئی حاضرم — با تو شد خوشنود اینک خاطرم
گفت من زافلاس نالاں بودہ ام — سخت با حال پریشاں بودہ ام

اس حکایت کا خاتمہ اِن اشعار پر کیا جاتا ہے :-

الاماں از مکر ابلیس الاماں، — الاماں از زور تلبیس الاماں،
ایں خطرہا و وساوس با نیاز — جو نجات از لطف حیّ کردگار
ایں حکایت یاد دار اے پر بصر — تو ازیں تزویر شیطاں درگزر
پختنِ شیر و برنجتِ خوب نیست — نزدِ اہلِ وجد ایں مرغوب نیست

چیست ایں شیرو بربخت اے فتا، خواستی تائید از غیرِ خدا

اِن اشعار کے مطالعہ سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ آزاد کی رائے اس مثنوی کے بارہ میں خلاف واقعہ ہے۔

دوسری مثنوی نواب سعادت علی خاں کے شکار کے بیان میں ہے اس کے اشعار سے فردوسی، طوسی کے تتبع کا اظہار ہوتا ہے۔ زبان کی شیرینی اور ترکیب کی چستی اس مثنوی کی خصوصیات ہیں۔ انشاؔ کی چلبلی طبیعت اور خوشگوئی نے مثنوی کے حُسن میں مزید چار چاند لگا دئے ہیں۔ مختلف مقامات سے اشعار نقل کئے جاتے ہیں:

شکار نامہ

اینک کنوں میگذرد در شمار بست فزوں از دو صد و یک ہزار
سالخوردہ در خامۂ انشاء وطن چند ہزار آہوئے مشکِ ختن،
بہ کہ کنوں صید مضامیں کنم بارگیِ ناطقہ را زیں کنم،

در تمہید کلام

از مددِ شیرِ خدائے ودود صورتِ عنقائے طرب پر کشود،
ذہن و ذکا رقص چو طاؤس کرد مست شدہ آہوئے صحرا نورد
طائرِ اقبال بہ نشو و نما سایہ فگن گشتِ بانِ ہما،
خیز د لا صبح سعادت دمید فصلِ گل و بادِ بہاری وزید

در تعریف حضور پر نور

اشرفِ خیلِ وزرائے زماں، ناظمِ ملکِ ہمہ ہندوستاں،
صفدر و منصور و سخی و شجاع بست کمر از پئے قتلِ سباع
تاختہ از خانہ بہ عزمِ شکار، کرد برو برجِ اسد جاں نثار

در تعریف خیمہ و خرگاہ و نوبت و نقارہ وَمَا یتعلّقُ بِذٰلِکَ

تا کہ نبرد خیمۂ زریں طناب آمدہ در برجِ حمل آفتاب
گشتِ ز نقارہ صدائے بلند زندہ بماں زندہ بماں بے گزند
دز دہلِ نقرہ در آمد بجوش تا بتواں تا بتواں، ہاں خروش
حلتِ صید است در آئینِ من، دینِ من و دینِ من و دینِ من
واشدہ زیں ساں دہنِ کرنا با دیدہ - با دیدہ - با دُعا

دشمن ایں خانہ جگر خوں بود — دوں بود و دوں بود و دوں بود
عیشِ بروں از حدِ اندازہ شد — رسمِ کہن از سرِ نو تازہ شد
غلغلۂ کوس بکیوان رسید — آب شدہ زہرۂ دیو سفید
کوہ چو غرّیدنِ پیلش شنید — صورتِ خرطوم و لے از دور دید
گفتِ بروں آمدہ از زیرِ ابر — صورِ اسرافیل پئے صید ببر
وقتِ ہماں است کہ سیمرغِ قاف، — بگذرد از قلۂ لاف و گزاف،
آنچہ ندیدست فریدوں بخواب — جملہ مہیا است درا در رکاب
چونکہ بدید ایں ہمہ عظم و شکوہ — لرزہ بر افتادہ براندامِ کوہ

تاریخ

فوجِ ظفر موج بایں عز و جاہ — گرد رسانید چو بر اوجِ ماہ
شوکتش انشاء بخط زر نوشت — فقرۂ تاریخ مظفر نوشت
۱۲۲۰

تعریفِ اسپ

خود چو بر اسپِ عربی برنشست — آمدہ بر فوجِ غزالاں شکست
اسپ چہ اسپ اشہبِ بادِ صبا — اسپ مگو شہ رخِ گلگونِ قبا،
اسپ بایں شوخیِ دلچسپ کو؟ — حور بگو - اسپ مگو - اسپ کو؟
اسپ مداں لمعۂ شرق است ایں — اسپ کجا چشمکِ برق است ایں
پیش رو جودتِ طبعِ سلیم — گام نہد بر برِ دوشِ نسیم
زیبِ دہ کوہ و بیابانِ نجد، — قیس اگر بنگرد آید بہ وجد
سیرت لیلےٰ رسدش در خیال — با ہمہ چالاکی و حسن جمال
بیندش ار نادرِ کشورستاں — وصف کند با ہمہ ایرانیاں

تیسری مثنوی کی یہ کچھ کم خصوصیت نہیں ہے کہ اس میں کوئی حرف نقطہ دار نہیں آیا ہے سرخیاں تک بے نقطہ ہیں مثلاً (۱) لوصہ در حمد مالک الملک (۲) لوصہ در مدح سرورِ کل (۳) لوصہ مدح سوار دلدل (۴) لوصہ در مدح مالک گاہ لوصہ در مدح حاکم عصر —— مثنوی کے خاتمہ پر ایک مناجات ہے وہ یہاں پیش کی جاتی ہے :-

عمر صد سالہ دہ الٰہم — اللّٰہم ارحم ارحم ارحم،
اسلام دہ و کمال آرام — آور عملِ مرام در کام

حاصلِ ہمہ ام سرور گردد — ہم سرور دوار دور گردد،
در دورۂ دہر دار مسرور — دہ در ارحم امارد و حور،
در عالم دار کردگار را، — او لادم را و سادہ آرا،

ایک اور مختصر فارسی مثنوی شرح "مائۃ عامل" ہے۔ اس میں عربی زبان کے قواعد سمجھائے گئے ہیں۔ نمونہ حاضر ہے:-

در معارف پنجگانہ

بدانکہ پنج معارف بود میاں عرب — نیافت است کسے غیر شاں در استقرا
بگوی مضمر و مدخول لام و ہم علم است — دگرچہ مبہم ایا عقل و ذہن را ملجا
مضاف سوئی ہماں ہر چہار نیچم شان — کتاب نیست بود ایں کلید گنج انشاء

رحمت نبی خاں ام۔ اے (علیگ)

نگار کے پرانے پرچے

۲۶ء جنوری = ۱۲ر — ۳۱ء جولائی، اگست فی پرچہ ۸ر - اکتوبر تا دسمبر فی پرچہ ۸ر —
۳۲ء فروری، مارچ فی پرچہ ۱۲ر - مئی، جون، جولائی فی پرچہ ۸ر - ستمبر و نومبر فی پرچہ ۸ر — ۳۴ء اکتوبر عہ ر
۳۷ء فروری عہ ر - جولائی ۸ر - اکتوبر عہ ر — ۳۸ء فروری ۸ر، اپریل تا دسمبر فی پرچہ ۸ر —
۳۹ء فروری تا جولائی - اکتوبر، نومبر فی پرچہ ۸ر — ۴۰ء فروری تا دسمبر (جون، جولائی، اگست نہیں ہی) فی پرچہ ۸ر — ۴۱ء مارچ تا دسمبر (اگست نہیں ہے) للعہ — ۴۲ء مارچ تا مئی فی پرچہ ۸ر - اگست، ستمبر، اکتوبر و نومبر فی پرچہ ۸ر — ۴۳ء مئی ۱۲ر - ستمبر تا دسمبر فی پرچہ ۱۲ر — ۴۴ء مئی تا دسمبر مسلسل ۱۲ر فی پرچہ
۴۵ء اپریل ۸ر - جون، جولائی فی پرچہ ۱۴ر - اگست تا دسمبر ۸ر فی پرچہ — ۴۶ء اپریل تا اگست فی پرچہ ۸ر - ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر فی پرچہ ۱۲ر - (مکمل فائل ۴۶ء = عہ ۱۰ر)

منیجر نگار لکھنؤ

عُرفی شیرازی

فارسی ادب کی تاریخ میں جو سچی شہرت عرفی شیرازی نے حاصل کی اس کی مثال بہت ہی کم ملے گی، اس کی شہرت صرف ہندوستان تک محدود نہ تھی بلکہ ترکی میں بھی اس نے اچھا خاصہ نام پیدا کر لیا تھا۔ گب لکھتا ہے کہ جامی کے علاوہ جن فارسی شعرا کا اثر ترکی ادبیات پر بہت گہرا پڑا وہ فیضی اور عرفی تھے۔ ضیا پاشا نے جو منظوم مقدمہ "خرابات" پر لکھا ہے اس میں عرفی اور فیضی کی بہت تعریف کی ہے۔

نام و نسب تذکروں میں عرفی کے نام کے متعلق اختلافات پائے جاتے ہیں۔ عبدالباقی نہاوندی (صاحب مآثر رحیمی) نے جو خود عرفی کا معاصر ہے اور جس نے اس کی زندگی کے دلچسپ واقعات بہم پہونچائے ہیں، اس کا نام خواجہ سیدی محمد لکھا ہے۔ دوسرا معاصر تذکرہ نویس عبدالنبی (صاحب میخانہ) ہے جس نے شاعر مذکور کے حالات خود اس کے خالو شمس الدین نام شیرازی سے سُن کر قلم بند کئے تھے۔ اس نے اس کا نام محمد حسین لکھا ہے، بقیہ تمام تذکرہ نگار جن میں تقی اوحدی (صاحب عرفات) اور تقی کاشی مولف خلاصۃ الاشعار ہیں (اول الذکر کی عرفی سے دوستی کا یہ عالم تھا کہ شیراز کے تمام شعرا اس پر حسد کرتے تھے) اس بات پر متفق ہیں کہ اس کا نام جمال الدین سیدی ہے۔

مآثر رحیمی کا جو نسخہ بانکی پور کے کتاب خانہ میں ہے اس میں "خواجہ" اور "سیدی محمد" کے درمیان کچھ فصل ہے، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ کاتب کو اس کے نام میں شبہ تھا۔ لیکن فہرست کتاب خانہ مذکور میں ایک جگہ اس کا نام "مولانا سید محمد" اور دوسری جگہ خواجہ سیدی محمد ہے جو مآثر رحیمی سے ماخوذ ہے، شعر العجم میں 'مآثر' اور عرفات کے بیان کی تطبیق اس طرح کی گئی ہے کہ "محمد" اس کا نام اور جمال الدین، اس کا لقب بتایا گیا ہے۔ حالانکہ عرفات میں نہایت واضح طور پر اس کا نام "جمال الدین سیدی" لکھا ہوا ہے، صاحب مے خانہ نے جو اس کا نام قلم بند کیا ہے وہ کہیں اور نہیں پایا جاتا۔ مشہور محقق براؤن نے عرفی کا نام جمال الدین محمد (بہ اضافہ محمد) اور بعض دوسرے تذکروں میں صرف جمال الدین (بہ حذف سیدی) پایا جاتا ہے۔

چونکہ عرفی کے متعلق سب سے زیادہ مستند قول تقی اوحدی کا ہے جس کی عرفی سے صرف ملاقات ہی نہ تھی بلکہ دونوں تقریباً پورے ۴ سال (۹۸۹ سے ۹۹۳ تک) ساتھ ساتھ رہے اور عرفی کی وفات کے بعد اس کے بعض عزیزوں کے ساتھ تقی نے اسکے اشعار پر اشعار کہے، اور اس کے انتقال کی تاریخ نظم کی، اس لئے مآثر رحیمی اور میخانہ کے اقوال مستند قرار نہیں پا سکتے۔

عرفی کے نام کے متعلق جو اشتباہ پیدا ہو گیا ہے اس کی بظاہر یہ وجہ ہے کہ اس کا نام وہی قرار پایا جو اس کے دادا کا تھا۔

اسی بنا پر بعض تذکرہ نویسوں نے اس کے اور اس کے دادا کے نام میں فرق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، مثلاً مؤلف نشترِ عشق نے اس کا نام جمال الدین اور دادا کا نام کمال الدین لکھا ہے۔

ہمیشہ بہار میں اس کا نام "سیدی" کے بجائے "صیدی" درج ہے۔ اس کو بہت آسانی سے کتابت کی غلطی پر محمول کیا جا سکتا تھا۔ لیکن میخانہ میں "صیدی" اس کا اول تخلص بتایا گیا ہے۔ اس سے اس کو کتابت کی غلطی کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا۔ لفظ "سیدی" سید سے علاقہ رکھتا ہے یا اس کا کوئی خاندانی نشان ہوگا کیونکہ اس کے دادا کے بھی نام کے ساتھ یہ لگا ہوا تھا۔

تمام تذکرہ نگار متفق ہیں کہ عرفی کے باپ کا نام زین الدین علی بلوی ہے، صرف میخانہ میں اس کا نام خواجہ بلوی لکھا ہے۔ شعر العجم میں زین الدین علی بلوی کے بجائے زین الدین بلوی ہے، "علوی" کتابت کی غلطی ہے اور "علی" کا حذف غیر شعوری طور پر ہوا ہے، چند دوسرے تذکروں میں بھی یہ حذف موجود ہے۔ بانکی پور کی فہرست میں بلوی اور علی دونوں لفظ محذوف ہیں، بہر حال یہ مسلم ہے کہ اسکے باپ کا پورا نام وہی ہے جو ادھر مذکور ہے "بلوی" کے متعلق یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہ تخلص رہا ہے۔ خاندانی لقب نہیں معلوم ہوتا۔ تعجب ہے کہ پروفیسر براؤن نے تمام ماخذ کے خلاف عرفی کے باپ کا نام بدر الدین لکھا ہے جو کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔

بقول مؤلف میخانہ خواجہ بلوی کا مولد شیراز ہی تھا۔ "در دفتر خانہائے شاہی بہ شغلے از اشغال حکام آں جا اشتغال داشت" مآثر رحیمی میں نہایت واضح طور پر لکھا ہے کہ عرفی کا باپ شیراز کی دار الحکومت میں ایک معزز عہدہ پر ممتاز تھا اور چونکہ ایران میں غیر مذہبی محکمہ جات کو عرف کہتے ہیں اسی مناسبت سے اس نے اپنا تخلص عرفی رکھا۔ لیکن میخانہ میں لکھا ہے کہ عرفی بچپن میں مولانا صیدی کے لقب سے ملقب ہوا اور اول جوانی ہی سے مشق سخن شروع کی، چونکہ اس کے اشعار بہت اعلیٰ درجہ کے ہوتے تھے اس لئے اس کے ساتھیوں نے اس کو عرفی تخلص عنایت کیا۔

اس کے دادا کے نام کے متعلق کسی قسم کی اختلاف رائے نہیں۔ اُن کا نام جمال الدین سیدی المعروف بہ "چادر باف" تھا یہی نام اس کے ہونہار پوتے کا بھی تجویز ہوا۔ چادر باف کے لقب سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید اس کے خاندان کو "چادر بافی" سے کسی قسم کا علاقہ رہا ہو۔

عرفی نے اپنے کلام میں جا بجا اپنے نام و نسب پر فخر کیا ہے کیونکہ برخلاف عام شاعروں کے وہ ایک معزز خاندان کا رکن تھا چنانچہ لکھتا ہے:

ایں جوہر ذات از شرف نسبت آباست — سودا ست بہ ابر ایں دُر اگر چہ سرِ یَم را

ہر چند کہ در کشمکش جاہ و مناصب — گم نام نمودند ہمہ دود ۂ ہم را

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ، — آثار پدید است صنادید عجم را

تا گوہر آدم نسبم باز نہ استد — زیبائے خود دار بشرم اصحاب کرم را

اما نبود وصف اضافی ہنر ذات — ایں فتوئی ہمت بود ارباب ہمم را

ایں برق سحابیست کہ جہد از گہر من، — مدح است ولے گوہر ذاتِ اب و عم را

وصف گل و ریحاں بہ ہوا باز نہ گردد ہر چند ہوا عطر دہد قوتِ شم را
المنۃ للہ کہ نیازم بہ نسب نیست اینک بہ شہادت طلبم لوح و قلم را

شیراز، عرفی کا بھی مولد تھا اور اس کے آبا و اجداد کا بھی، چنانچہ لکھتا ہے :-

نازش سعدی بہ مشت خاکِ شیراز از چہ بود گر نہ می دانست باشد مولد و ماوائے من

البتہ اصفہان میں اس کے بعض عزیز موجود تھے چنانچہ انھیں کے ساتھ تقی اوحدی اصفہانی نے عرفی کے اشعار پر اشعار لکھے تھے

پیدائش عرفی کے بچپن کے حالات کسی تذکرہ میں نہیں ملتے۔ نہ اس کا سنہ پیدائش کسی نے لکھا۔ اس لئے محض دوسرے واقعات سے اسکی پیدائش کا سال نکالا جائے گا۔ یہ مسلم ہے کہ اس کی وفات ۹۹۹ھ میں ۳۶ سال کی عمر میں واقع ہوئی اس لحاظ سے اسکی پیدائش کا سال ۹۶۳ھ قرار پاتا ہے۔ اس سلسلہ میں عرفات العاشقین کا ذیل کا قول جانچنا ضروری ہے۔[1]

"راقم این مقال درعنفوان حال چوں در جادۂ شانزدہ سالگی قدم وجود در نہادم از اصفہان کہ مولد و موطن اصلیت بود متوجہ شیراز شدم کہ منزل آبا و اجداد بود، و دراں جا بہ خدمت و صحبت مولانا عرفی رسیدم پنج سال قبل ازاں کہ وے متوجہ سفر ہند شود، اکثر اوقات در ملازمت او شعرائے دیگر کہ مجتمع بودند۔۔۔۔ بسیار از بابا فغانی وغیرہ طرح می شد و دراں اثنا میانۂ وے و مولانا وحشی مباحثات غائبانہ واقع شد و دراں وقت سن وے تخمیناً بہ سرحد سی سالگی رسیدہ بود و اتحاد وے با مخلص بسرحدے بود کہ اکثر شعرا در رشک بودند"۔

صاحب عرفات کی پیدائش ۹۶۳ھ میں ہوئی تھی، اس حساب سے ۹۸۹ھ میں وہ شیراز آیا ہوگا اور وہاں وہ ۴ سال یعنی ۹۹۳ھ تک مقیم رہا۔ صاحب خلاصۃ الاشعار نے عرفی کے ورود ہند کی تاریخ ۹۹۴ھ لکھی ہے اس لحاظ سے بھی عرفی اور تقی اوحدی کی ملاقات کا سال ۹۹۹ھ قرار پاتا ہے، بہرحال ۹۹۳ھ میں عرفی کی عمر ۳۰ سال کی ہوتی ہے اسلئے اسکی تاریخ پیدائش ۹۶۳ھ صحیح طور پر قرار پاتی ہے۔

عرفات کی مذکورۂ بالا عبارت صاف نہیں ہے۔ ایک بات دوسری بات سے اس طرح ملی ہوئی ہے کہ دونوں کو الگ کرنا دشوار ہے، اس عبارت کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ ۹۸۹ھ میں جب مولف عرفات شیراز آیا تو یہاں عرفی موجود تھا۔ اسکے پانچ سال بعد وہ ہندوستان کی طرف متوجہ ہوا۔ ان ایام میں اکثر شاعروں سے مباحثہ رہتا تھا۔ وحشی یزدی سے بھی غائبانہ اور تحریری مباحثے ہوئے۔ ان دنوں اسکی عمر تقریباً ۳۰ سال کی تھی اور اس کی اور مؤلف کی دوستی قابل رشک تھی۔

وحشی کا انتقال ۹۹۱ھ میں ہوا ہے، اسوقت عرفی کی عمر ۲۸ سال کی تھی۔ "دراں وقت" کا مطلب ۹۹۲ اور ۹۹۳ ہجری سے ہے۔ اس وقت عرفی کی عمر ۳۰ سال کے لگ بھگ ہوتی ہے۔

قیام شیراز بہت کم شاعر ایسے ہیں جن کو تلاش علم، تلاش معاش اور تلاش ممدوح کے لئے سفر نہ کرنا پڑا ہو عرفی بھی اس کلیئے سے مستثنیٰ نہیں تھا، البتہ چونکہ شیراز دار العلم و دار الفضل تھا اس لئے اسے تلاش علم میں دوسری جگہ جانے کی ضرورت

---

[1] ورق ۵۰۲، ۵۰۳ (نسخۂ بانکی پور)

لاحق نہ ہوئی چنانچہ تمام تذکرہ نویس متفق ہیں کہ عرفی نے اپنے ہی وطن میں کسب علوم کئے، وہیں اس کی تعلیم و تربیت ہوئی۔
اس نے اولاً عربی صرف و نحو، منطق و عروض کی طرف توجہ کی اور اس میں خاصی استعداد بہم پہونچائی، مولف بہارستان سخن نے لکھا ہے کہ معمولی علوم کے علاوہ مصوری و نقاشی میں بھی مہارت تامہ حاصل کی تھی۔

عرفی نے جس ماحول میں ہوش سنبھالا وہ سیاسی اعتبار سے بہت اہم تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے ابتدائی ۲۱ سال شاہ طہماسپ (۹۳۰ - ۸۴ ہجری) کے عہد حکومت میں گزارے، اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ اس کا وطن شیراز اس کے قیام ایران یعنی ۹۹۴ کے ۵ سال بعد تک صفویہ کے قبضہ میں براہ راست نہیں آیا تھا بلکہ سرکش سرداروں کی حکومت کا جزو تھا۔ شاہ اسماعیل بانی سلطنت صفویہ (متوفی رجب ۹۳۰) کا تمام زمانہ لڑائیوں میں صرف ہوا تھا۔ شاہ طہماسپ کا بھی بیشتر حصۂ زندگی اسی طرح گزرا، اس نے ترکوں کے ساتھ مسلسل جنگیں کیں۔ ازبکوں کے ہاتھوں اسکو بے حد پریشانی اُٹھانا پڑی۔ گرجیوں کے ساتھ جو اس نے لڑائیاں کیں اس میں طرفین کا بہت نقصان ہوا۔ شروانیوں سے اس کی پرخاش جاری رہی، خان احمد والی گیلان سے برسرپیکار رہا۔ تبریز کے شورہ پشتوں کو زیر کرنے میں بڑی دقتوں کا سامنا اُٹھایا۔ علاوہ ازیں وہ اپنے خانگی اور خاندانی تعلقات کے بارہ میں بھی بڑا بدقسمت تھا۔ اس کے بھائی سام مرزا نے اس کے خلاف بغاوت کی اور دوسرا بھائی القاص بھی باغی اور غدار ثابت ہوا اور قلعہ قہقہہ میں بند کر دیا گیا۔

مختصر یہ کہ شاہ طہماسپ نے اگرچہ ۵۰ سال سے زاید حکومت کی لیکن اس کو کبھی یکسوئی و اطمینان نصیب نہ ہوا۔ مگر اس نے سلطنت صفویہ کی جڑ مستحکم کر دی، دول خارجہ پر اپنا رعب بٹھا دیا اور اندرونی فتنہ و فساد کا سدِ باب کر دیا۔ ان وجوہ سے علوم و فنون کی ترقی کے موقع نکل آئے۔

شاہ طہماسپ کے مرتے ہی ایران میں کچھ دنوں کے لئے مستقلاً فتنہ و فساد کا دروازہ کھل گیا۔ اس کے انتقال پر اس کے ۹ بیٹوں میں تخت کے لئے "جھگڑا ہوا" اس میں اسماعیل کو کامیابی ہوئی اور وہ اسماعیل ثانی کے لقب سے تخت ایران پر متمکن ہوا۔ اسکا زمانہ "خونیں دور" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اولاً اس نے اپنے دو بھائیوں کو قتل کرایا پھر شاہزادوں کے قتل کا بازار گرم کیا۔ دس ماہ کے اندر ۶ شہزادے موت کے گھاٹ اُتار دئے گئے۔ صرف خورد سال شاہ عباس میرزا جو شاہ عباس اعظم کے نام سے ایران کا سب سے زیادہ زبردست حکمراں گزرا ہے، باقی بچا۔ اس کے اس طرح بچنے کو اسکندر منشی معجزہ اور تائید غیبی سمجھتا ہے۔[1] ایک سال چار ماہ کے بعد شاہ اسماعیل کا انتقال ہوا اور جیسی اس کی زندگی شرمناک تھی ویسا ہی اس کا خاتمہ بھی ہوا۔ اس کی وفات پر محمد خدابندہ تخت نشین ہوا تخت پر بیٹھتے ہی اس نے پری خاں خانم کو جس نے شاہ طہماسپ کے انتقال کے وقت فتنہ و فساد میں نمایاں حصہ لیا تھا، معہ اسکے ماموں اور شاہ اسماعیل کے خورد سال بچے کے، موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ ان سفاکانہ قتلوں کا نتیجہ ہوا کہ شاہی خاندان میں صرف خدابندہ کے چار لڑکے باقی رہے غرض اس طرح مادر زاد اندھا خدابندہ ۱۰ سال کی ناتمام حکومت کے بعد ذیقعدہ ۹۹۵ھ میں شاہ عباس کو زمام سلطنت دے کر تخت سے دست بردار ہو گیا۔

---

[1] مؤلف تاریخ عالم آرائے عباسی

ایسی سیاسی کش مکش کے زمانہ میں عرفی نے آنکھیں کھولیں - بڑھا - پلا اور مشق سخن جاری کی - عجب یہ کہ مولف شعرالعجم ایران کی سیاسی حالت کا جایزہ لینے میں ناکام رہے ورنہ ان کے قلم سے یہ الفاظ نہ نکلتے:

"عرفی نے جب ہوش سنبھالا تو سلطنت صفویہ کا شباب تھا اور شاہ طہماسپ اور عباس کی علم پروری نے تمام ایران کو علم و ہنر کی نمایش گاہ بنا دیا تھا۔"

جیسا اوپر عرض کیا گیا، عرفی کی زندگی کے بیس اکیس سال واقعی ایسے دور میں گزرے جو کسی قدر پُرسکون ضرور تھا۔ لیکن شاہ عباس کے زریں عہد کی روشنی وہ اپنی آنکھوں سے کبھی نہ دیکھ سکا کیونکہ اس بادشاہ کی تخت نشینی کے تین سال قبل ہی وہاں کی غیر مطمئن حالات سے اُکتا کر وہ ہندوستان چلا آیا تھا۔ اس کے وطن شیراز پر شاہ عباس نے اپنی تخت نشینی کے تیسرے سال قبضہ کیا۔

بہر حال حالات خواہ موافق سمجھو یا ناموافق اس وقت ایران میں شعر و شاعری کا چرچا بڑے زور و دل پر تھا۔ محتشم کاشی (متوفی ۹۹۶) وحشی یزدی، غیرتی شیرازی وغیرہ نے غزالی کے طرز کو اور زیادہ شوخ کر دیا تھا اور تمام ملک ان کی زمزمہ سنجیوں سے گونج اُٹھا تھا۔ عرفی نے اپنے اظہار کمال کے لئے یہی میدان تجویز کیا تھا اور باوجود کم عمری کے پرانے اور کہنہ مشق اُستادوں سے طبع آزمائی شروع کر دی۔

اس وقت شاعری کے مرکز بہت سے تھے جن میں کاشان، یزد اور شیراز کے شعرا سے عرفی نے مباحثہ اور مکالمہ شروع کیا۔ کاشان میں مناظرہ کا عام طور پر رواج ہو چلا تھا۔ یہاں کے اساتذہ میں محتشم اور حیدر معمائی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ عرفات میں ہے: "محتشم۔ از اول شاہ طہماسپ تا ظہور شاہ عباس در ایران بہ اُستادی و شاعری مستقل بود۔"

غضنفر، فہمی کاشی، حاتم کاشی، باقر کاشی، سنجر کاشی، مقصود خردہ خاص طور پر مناظر تھے۔ غضنفر اور وحشی کے جھگڑے، فہمی اور وحشی کے مناظرے، حاتم اور فہمی کی چوٹیں، باقر اور حاتم و فہمی کے مباحثے "خلاصۃ الاشعار"، "مآثر رحیمی" اور "عرفات العاشقین" کے صفحات کی زینت ہیں۔ شیراز کے شاعروں میں غیرتی، حسین کاشی، عارف لاہجی اور رضائی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یزد کے اُستادوں میں وحشی سب سے زیادہ ممتاز تھا۔ اس کا بھائی بھی اچھا خاصہ شاعر گزرا ہے۔ وحشی نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ کاشان میں صرف کیا چنانچہ وہاں کے بیشتر شاعروں سے دو بدو مناظرے ہونے کے واقعات خلاصۃ الاشعار میں خاص طور پر مذکور ہیں۔

عرفی نے ان تینوں مرکزوں کے اساتذہ سے طبع آزمائی کی۔ شیراز کے شعرا سے تو اس نے رو در رو مقابلہ و مناظرہ کیا جب تقی اصفہانی ۹۸۹ھ میں شیراز گیا تو اس نے مشہور شعرا کے نام دریافت کئے لوگوں نے غیرتی کا پتہ دیا۔ شیراز میں ایک دوکان تھی جو شعرا کا دنگل تھا۔ یہیں شیراز کے شعرا مشاعرہ کرتے تھے۔ مشاعرہ میں غیرتی اور عرفی کا مباحثہ ہوا۔ عرفی نے دعوی کے دونوں پہلو لئے اور دونوں میں غیرتی پر غالب آیا۔ اس طرح[1] کے مناظرہ کا ذکر مآثر میں بھی پایا جاتا ہے۔

---

[1] شعرالعجم ج ۳، صفحہ ۸۳ — [2] مآثر رحیمی (بانکی پور نسخہ قلمی) ورق ۷۲

اس دور میں فغانی کی اتباع کا رواج اس درجہ ترقی پذیر تھا کہ ہر مستند شاعر اس کی غزلوں پر غزلیں لکھتا چنانچہ محتشم کاشانی اور دوسرے کاشان کے شعرا نے فغانی کے طرز پر غزلیں لکھیں اور عرفی نے بھی اسی کی غزلوں کا جواب لکھا — اس طرح سے کاشان کے شعرا سے اس نے تحریری مناظرے کئے۔ اگرچہ کسی تذکرہ سے صاف طور پر پتہ نہیں چلتا کہ اس نے محتشم سے بھی مباحثہ و مکالمہ کیا یا نہیں۔ لیکن فغانی کے طرز کی دونوں نے پیروی کی ہے اس سے شبہ ہوتا ہے شاید دونوں میں تحریری مباحثہ بھی ہوا ہو۔

وحشی اس دور کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ کاشان کے بیشتر شعرا سے اس نے مناظرے کئے۔ جھگڑے ہوئے۔ رکیک ہجویں لکھی گئیں۔ عرفی باوجود کم عمر ہونے کے وحشی ایسے کہنہ مشق شاعر کے مقابل خم ٹھونک کر آگیا۔ موخر الذکر اس وقت یزد میں تھا اور عرفی شیراز میں، اس لئے دونوں میں کئی بار تحریری مباحثے ہوئے تقی اصفہانی نے اس کی طرف صاف اشارہ کیا ہے۔ اور چونکہ اس وقت شیراز میں عرفی ہی کی صحبت میں تھا اس لئے اس کا قول نہایت ہی مستند ہے۔

عرفی، وحشی سے ۲۵ سال چھوٹا تھا۔ تقی اوحدی کے بیان کے موافق عرفی نے مناظروں اور مباحثوں کے میدان میں ۹۸۹ھ کے قریب قدم رکھا تھا اور چونکہ ۹۹۱ھ میں وحشی مر گیا تھا اس لئے ان دونوں کے مناظرے تقریباً ۲ سال تک جاری رہے ہونگے۔ غرض کہ عرفی نے اپنی زندگی کی ۳۰ - ۳۱ منزلیں ۹۹۳ھ میں ختم کیں۔

عرفی کی اس زندگی کا کوئی مخصوص کارنامہ باقی نہیں رہا جس سے ہم اس کی شاعری کا اندازہ لگا سکیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس عمر کا بیشتر حصہ شعر و شاعری میں صرف ہوا، ایران کی زندگی ہی میں اس نے اس میدان میں کافی نام پیدا کر لیا تھا، وحشی یزدی محتشم کاشی، غیرتی شیرازی جیسے کہنہ مشق شاعروں کے سامنے ایک نوآموز اور نوجوان کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے لیکن وہ ایک استاد کی طرح ان سے زور آزمائی کرتا ہے۔ تقی اوحدی کے قول کے مطابق ۹۸۹ھ کے قبل ہی جب کہ اس کی عمر ۲۵ سال سے متجاوز نہ تھی شعرا کا ایک گروہ ہر وقت اس کی خدمت میں رہتا تھا۔ خود تقی نے جو ایک نوآموز شاعر اور ادیب و مورخ تھے اور عرفی کی صحبت سے ۴ سال تک مستفید ہوتے رہے۔ یہ سب واقعات عرفی کا کمال ثابت کرنے کے لئے لکھے ہیں۔ اس کے چھ ہزار اشعار جو ضایع ہو گئے ایران ہی کی زندگی میں کہے گئے تھے۔

ورود ہند یہ مسلم ہے کہ ایران میں عرفی کو کوئی خاص ممدوح نہ مل سکا۔ سبب ظاہر ہے۔ جب اسکی شاعری چمکی تو وہاں کی مرکزی حکومت کی باگ جس کی ترقی کا ابھی عنفوان ہی تھا ایک کمزور ہاتھ میں تھی اسی وجہ سے اہل علم کی حسب دلخواہ قدر دانی نہ ہو سکی۔ یہ حقیقت حال ہے کہ طہماسپ اور عباس ایسے جلیل القدر بادشاہوں نے شعرا کی قدر دانی معقول طور پر نہیں کی۔ اس کے برعکس ہندوستان میں علما و فضلا کی قدر دانی کا کچھ ایسا قدرتی سامان جمع ہو گیا تھا کہ ایران کے گوشہ گوشہ سے شعرا اور اہل علم کھنچے آتے تھے۔ اس عام سبب کے علاوہ عرفی کے آمد ہند کی کوئی اور خاص وجہ معلوم نہ ہو سکی۔ عرفات کا مؤلف خاموش ہے، البتہ میخانہ میں ذیل کا واقعہ[1] مندرج ہے جو بظاہر بے محل و بے ربط معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] صفحہ ۱۷۶

"وسبب برآمدن او از شیراز ازیں رہگذر است کہ در سن چہاردہ و با نزدہ حسن او قبول تمام عیاری بہم رسانده بود و آبلہ گشیدہ چوں سال عمرش بہ بیست رسید آبلۂ سرشاری بر آورد، بعد از انقضائے اشتداد و استخلاص آں مرض تغیرے در چہرۂ او بہم رسید چنانچہ ہر کس کہ او را می دید از و تنفر می کرد، مولوی ازیں مقدمہ بغایت آزردہ بہم بود و بہ خاطر نمی رسانید کہ

چناں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند

از غرور جہلی کہ داشت بنابراں از وطن خروج کردہ"

یہ مسلم ہے کہ وہ ۹۹۴ھ میں ہندوستان آیا جب کہ اس کی عمر ۳۱ سال کی ہو چکی تھی، صاحب خلاصۃ الاشعار نے واضح طور پر یہی تاریخ لکھی ہے، عرفات کے بھی بیان سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ تقی اوحدی نے لکھا ہے کہ اس کے ورود شیراز کے ۵ سال بعد عرفی ہندوستان کی طرف روانہ ہوا، چونکہ ۹۸۹ھ میں تقی کا شیراز جانا مسلم ہے اس لئے عرفی کا ۹۹۴ھ میں ہندوستان آنا قطعی ہے اگر میخانہ کا قول تسلیم کیا جائے تو عرفی کی وطن سے روانگی ۹۸۲ھ میں ثابت ہوتی ہے اور چونکہ ۹۸۹ھ سے ۹۹۳ھ تک اس کا شیراز کا قیام یقینی ہے اس لئے میخانہ کی روایت پایۂ تحقیق کو نہیں پہونچ سکتی۔ مزید براں جو وجوہ اس نے بیان کئے ہیں وہ بھی قابل قبول نہیں معلوم ہوتے، اول تو لوگوں کا تنفر بیان کیا ہے، پھر غرور جہلی وجہ تحریک قرار دی ہے۔

شعر العجم میں لکھا ہے[1] کہ بعض تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ شاہزادہ سلیم کے حسن پر "عاشقانہ عاشق" ہو کر بلوایا ہے۔ یہ جملہ الوبلیہ اور چہار درویش کے قصہ کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ تعجب ہے کہ مولانا شبلی جیسے محقق نے اس بات کو کیونکر قبول کر لیا۔ میں نے ابتک جتنے تذکرے دیکھے ہیں ان میں سے کسی میں اس کے وطن چھوڑنے کی یہ وجہ نظر نہ آئی۔ جن تذکروں میں شاہزادہ سلیم سے خاص ارتباط رکھنے کا بھی ذکر ہے ان میں بھی اس کے عاشقانہ عشق کو وطن سے نکلنے کی وجہ قرار نہیں دی گئی ہے، حقیقت ہے کہ مولانا کا اشارہ تمہید ہے ایک بہت بڑے واقعہ کی جس کا بیان آیندہ صفحات میں کیا جائے گا۔

قیام احمد نگر تا ۹۹۵ ہجری

عرفی کس راستے سے ہندوستان میں داخل ہوا اس کے ذکر سے اکثر تذکرے خالی ہیں۔ معاصر تذکرہ نگار مثلاً عبدالباقی عبدالنبی، تقی اوحدی نے بھی کچھ نہیں لکھا۔ شعر العجم[2] بھی اس بارہ میں صرف اتنا لکھتا ہے کہ اس نے ہندوستان کا رخ کیا۔ راستہ میں ڈاکہ پڑا اور اس کی کل کائنات جاتی رہی۔ اس پر یہ رباعی کہی:

دوشینہ کہ بُرد برد بر دوشم بود — زانو چو خرد بر آنو در آغوشم بود
پوشیدنیٔ نہ داشتم غیر از جسم — چیزے کہ بزیر سر نہم گوشم بود

لیکن دوسرے معاصر اور مشہور تذکرہ نویس یعنی تقی کاشی نے لکھا ہے کہ وہ براہ دریا ہندوستان آیا، ایک تیسرے معاصر امین احمد رازی کے بیان سے بھی اسی قول کی تائید ہوتی ہے، غلام علی آزاد نے ید بیضا اور سرو آزاد دونوں میں لکھا ہے کہ عرفی دریا کے راستہ ہندوستان میں داخل ہوا، ہمیشہ بہار اور تحفۃ الکرام کے بیانات بھی اسی امر کے موید ہیں۔ فہرست بانکی پور

---

[1] ج ۲ صفحہ ۸۴ — [2] ج ۲ صفحہ ۸۴

میں بھی دکن کے قیام کا ذکر ہے۔ محبوب الزمن میں جو صرف شعرائے دکن کا تذکرہ ہے عرفی کا شمول اس قیاس کی تائید کرتا ہے کہ وہ دکن میں مقیم رہ چکا ہے۔ البتہ نشتر عشق میں شمالی ہندوستان سے دکن جانے کا ذکر ہے جو پایۂ تحقیق تک نہیں پہونچتا مزید براں شیراز سے ہندوستان آنے کا راستہ یہی تھا۔ دسویں اور گیارھویں صدی ہجری میں بحری سفر بہت آسان متصور ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے ہزارہا اہل علوم مثلاً مولانا نظیری، ظہوری، ملک وغیرہ اسی راہ سے ہندوستان میں داخل ہوئے اس لئے اگر عرفی نے بھی یہی راستہ اختیار کیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

تحفۃ الکرام، مرآۃ البیضا، سرو آزاد اور ہفت اقلیم میں لکھا ہے کہ عرفی بندر جرون[1] ہو کر آیا ہے، اس بندر کو اس زمانہ میں خاص اہمیت حاصل تھی۔

ہندوستان میں آکر وہ سیدھا احمد نگر آیا۔ تقی کاشی، اور امین احمد کے علاوہ ہمیشہ بہار[2] نے صراحتاً لکھا ہے کہ:۔

"ہنگامے کہ عزم سواد ہندوستان نمود اول بہ دکن آمد و چندے در احمد نگر با مولانا ملک تقی و مولانا ظہوری صحبت داشت و باز متصل اکبر آباد در فتحپور سیکری رسید"۔

تقی اور امین احمد نے ملک اور ظہوری سے ملاقات نہیں لکھی اور بقیہ تذکروں میں صرف دکن کا ورود لکھا ہے۔ احمد نگر کا نام نہیں لکھا، لیکن چونکہ احمد نگر دکن ہی میں ہے اس لئے ان دو قسم کے بیان میں تضاد نہیں ہے۔

بہرحال چونکہ اس دور میں ظہوری اور ملک کا قیام ان دنوں احمد نگر ہی میں تھا۔ اس لئے عرفی اور ان لوگوں کی ملاقات تقریباً یقینی ہے۔ عرفی اور ظہوری کے درمیان خط و کتابت بھی ہوتی تھی۔ ظہوری کا عرفی کے پاس شال کا ہدیہ بھیجنا اور آخر الذکر کا ایک طنز آمیز خط لکھنا اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ دونوں کی ملاقات احمد نگر میں ہو چکی ہے۔

تمام تذکرے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اس بات پر متفق ہیں کہ احمد نگر یا دکن میں اس کی قدر دانی حسب دلخواہ نہیں ہوئی اور ہوتی تو کیوں کر ہوتی۔ وہاں کا بھی حال ویسا ہی تھا جیسا عرفی نے اپنے وطن میں دیکھا تھا۔ یہ دور مرتضیٰ نظام شاہ (۹۷۲-۹۶) کی حکومت کا تھا۔ آخر عمر میں وہ دیوانہ ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے سارے انتظام میں خلل پڑ گیا تھا۔ قتل عام کا بازار گرم تھا۔ نظام شاہی سلطنت کی بنیاد متزلزل ہو رہی تھی ۹۹۶ اور ۹۹۸ کے درمیان دو مرتبہ ایسا زبردست قتل عام ہوا کہ جتنے پردیسی تھے ان میں سے بیشتر موت کے گھاٹ اُتار دئے گئے۔ افواہ اُڑی کہ ظہوری اور ملک بھی اسی ہنگامہ کی نذر ہو گئے۔ (بدایونی)

ایسے حالات میں شعرا کی قدر دانی ناممکن تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عرفی کسی دکنی دربار سے متوسل نہ ہو سکا اور غالباً ایک سال کے اندر ہی وہ وہاں سے شمالی ہندوستان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

عرفی کی زندگی میں دکن کا قیام کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ نہ بادشاہ سے اس کا تعلق ہو سکا اور نہ اہل دول سے۔ اسکا ثبوت

---

[1] ج ۳ ص ۸۴ — [2] جرون (ہرمز نو) جزیرہ است۔ در دریا قریب بہ ساحل فارس (میخانہ صفحہ ۴۵۸) مآثر رحیمی ج ۳ میں اس کا نام "جرون" لکھا ہے دیکھو صفحہ ۹۲۶، ۱۴۷۳، ۱۵۶۶ — [3] نسخہ بانکی پور ورق ۵۸

یہ ہے کہ اس کے موجودہ کلیات میں کوئی نظم یا قصیدہ کسی دکنی امیر یا سلطان کے نام کا نہیں ہے۔

شمالی ہند کا قیام تا ۹۹۹ ہجری

۹۹۴ کے آخر یا ۹۹۵ ہجری کی ابتدا میں عرفی نے شمالی ہندوستان کی طرف رخ کیا اور یہاں اگرچہ سیکڑوں امیر اور قدر دان تھے لیکن ان سب میں اس نے فیضی کو منتخب کیا جسکی وجہ بقول شبلی یا تو یہ تھی کہ اس کے دربار کی رسائی آسان تھی یا یہ کہ سخن شناسی کی جو توقع فیضی سے ہو سکتی تھی اور کسی سے نہیں ہو سکتی تھی۔

عرفی، فتحپور سیکری میں فیضی سے ملا۔ فیضی نے اس کی بڑی عزت کی اسی درمیان میں فیضی نے پنجاب اور سرحد کا سفر کیا۔ صفر ۹۹۴ میں جب یوسف زئی پٹھانوں پر اکبر نے فوجیں بھیجیں تو فیضی بھی اس مہم پر مامور کیا گیا تھا۔ غالباً اس کا سفر اکبر کے ہمرکاب ہوا ہوگا جس نے ۹۹۴ ہجری میں کشمیر کی فتوحات کے سلسلہ اٹک میں قیام کیا تھا۔ بدایونی نے لکھا ہے کہ اس سفر میں عرفی اٹک تک فیضی کے ہمرکاب رہا اور اس کی تمام ضروریات فیضی ہی کی سرکار سے پوری ہوتی رہیں۔

لیکن فیضی اور عرفی کی دوستی ایک سال سے زیادہ نہ قایم رہ سکی۔ کیونکہ تمام تذکرے متفق ہیں کہ فیضی کے دامن دولت سے انقطاع کے بعد عرفی نے حکیم ابوالفتح گیلانی سے روابط پیدا کئے اور اس کی صحبت سے اس نے کافی استفادہ کیا۔ اور چونکہ حکیم مذکور کا انتقال ۹۹۷ھ میں ہوا اس لئے اس سے قبل فیضی سے قطع تعلق ضرور ہو گیا ہوگا۔

فیضی سے تعلق منقطع ہو جانے کی وجہ بقول شبلی، عرفی کی نخوت پرستی ہے۔ لیکن بظاہر صرف یہی سبب نہ رہا ہوگا عرفی دربار شاہی سے متعلق ہونا چاہتا ہوگا، لیکن ابوالفضل اور فیضی کے آگے اس کا چراغ نہیں جل سکتا تھا اور اس کو کامیاب نہ ہونے دینے کا سبب یہ ہوگا کہ اس کی جودت طبع، سرعت فکر اور وقت نظر کی وجہ سے دونوں کو اس کا خطرہ محسوس ہوا ہوگا کہ اگر اس کو دربار میں باریابی حاصل ہو گئی تو پھر ان کی شہرت کا چراغ گل ہو جائے گا۔ مگر بدایونی نے قطع تعلق کی وجہ ذیل کی طنز آمیز گفتگو قرار دی ہے جو شعر العجم میں بھی منقول ہے:-

"روزے[1] بہ خانۂ شیخ فیضی آمد چوں سگ بچہ را با شیخ مخلوط دید برسید کہ ایں مخدوم زادہ را چہ نام است با شیخ گفت 'عرفی'، او در بدیہ گفت "مبارک باشد" (مبارک فیضی کے والد کا نام تھا)

یہ واقعہ اکثر تذکروں میں مذکور ہے لیکن خافی خاں نے اس کو ۱۰۰۱ھ کا قرار دیا ہے۔ اگر یہ تاریخ صحیح ہے تو یہ واقعہ بالکل غلط ثابت ہو جائے گا اس لئے کہ عرفی اس کے دو سال قبل ہی فوت ہو چکا تھا۔

ایک دوسرا واقعہ صرف شعر العجم میں، خافی خاں کے حوالے سے منقول ہے، "ایک دفعہ (عرفی) ابوالفضل سے ملنے گیا دیکھا تو ابوالفضل قلم دانت میں دابے ہوئے سوچ میں بیٹھا ہے، سبب پوچھا۔ ابوالفضل نے کہا بھائی صاحب کی تفسیر بے نقط کا دیباچہ اسی صنعت میں لکھ رہا ہوں۔ ایک موقع پر والد کا نام آگیا ہے چاہتا ہوں کہ نام بھی آئے اور صنعت کا التزام بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ عرفی نے کہا تردد کی کیا بات ہے اپنے لہجہ میں مبارک لکھ دیجئے"۔

---

[1] منتخب التواریخ ج ۳ ص ۲۸۵

یہ واقعہ بھی ۱۰۰۱ھ کا بتایا گیا ہے، اگر یہی تاریخ صحیح مان لی جائے پھر بھی اس واقعہ کے سرتاپا غلط ہونے میں کسی کا شبہ نہیں رہ جاتا کیونکہ عرفی کا انتقال دو سال قبل ہی ہو چکا تھا، لیکن اس واقعہ کو ۱۰۰۱ھ کے بہت بعد کا سمجھنا چاہئے کیونکہ "سواطع الالہام" (فیضی کی تفسیر بے نقط) ربیع الثانی ۱۰۰۲ھ میں تکمیل کو پہونچی اور اس کا دیباچہ اس سنہ کے بعد لکھا گیا ہوگا بلکہ زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ ابوالفضل نے فیضی کے انتقال کے بعد اس کام کو پورا کرنا چاہا ہوگا اور چونکہ فیضی کا انتقال صفر ۱۰۰۴ھ میں ہو چکا تھا اس لئے اس واقعہ کو اس کے بعد کا سمجھنا زیادہ قرین صحت ہے۔ حالانکہ اس کے پانچ سال قبل ہی عرفی سفر آخرت اختیار کر چکا تھا۔ شعر العجم جیسی معتبر تاریخ میں ایسے لایعنی واقعات کا جگہ پا جانا حیرت انگیز ہے۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ مخزن الغرائب اور نشتر عشق میں موجود ہے، ابوالفضل اور فیضی نے عرفی کو اکبر کے سامنے ذلیل کرنے کی کوشش کی لیکن آخر میں خود ذلیل ہوئے، مخزن نے یہ واقعہ نقل کر کے خود اس کی تردید کی ہے۔

ابوالفتح گیلانی سے تعلقات تا ۹۹۷ھ ہجری

حکیم ابوالفتح اگرچہ منصب کے لحاظ سے امرائے دربار اکبری میں سب سے کم پایہ کا تھا لیکن بڑا زبردست عالم اور علم و فضل کا بڑا قدردان تھا۔ اسی وجہ سے عرفی نے اس سے تعلقات پیدا کئے۔ اول اس نے ایک قصیدۂ رحیہ لکھ کر پیش کیا۔ غالباً یہ سب سے پہلا قصیدہ تھا جو کسی کی مدح میں لکھا گیا۔ اس سے عرفی کی آن ٹوٹی، اس کا اسے بے حد صدمہ ہوا، چنانچہ قصیدہ میں اس کے اشارے پائے جاتے ہیں:

۱- خیال بندگیت دوش نقش می بستم — زروے کسب شرف نے زروے استعداد

۲- بہ خدمت آمدم اینک بگوچہ مصلحت است — بر آستان تو باید نشست یا استاد

عرفی نے اس کے فیض صحبت سے بڑی ترقی کی، اس کا اشارہ حکیم صاحب نے ایک رقعہ میں جو خان خاناں کے نام ہے کیا ہے، میخانہ میں بھی لکھا ہے[1]:- "از فیض تربیت آں صاحب عیار دانش از حضیض پستی بہ مقام اوج بلندی رسید"

عرفی نے حکیم مذکور کی احسان مندی کا پورا حق ادا کر دیا۔ جس زور کے قصیدے حکیم صاحب کی شان میں لکھے اکبر و خان خاناں کی مدح میں نہ لکھے۔ افسوس یہ ہے کہ عرفی حکیم ابوالفتح کے دامن دولت سے ایک سال سے زیادہ وابستہ نہ رہ سکا کیونکہ حکیم کا انتقال ۹۹۷ھ میں ہو گیا[2]، عرفی پر اس واقعہ کا بہت اثر ہوا چنانچہ اس وقت جو قصیدہ خان خاناں کی مدح میں لکھا اس میں کہتا ہے:-

---

[1] میخانہ صفحہ ۱۷۶ — [2] ۹۹۴ھ میں حکیم ابوالفتح سرحدی پٹھانوں کی مہم پر بھیجے گئے تھے۔ فیضی بھی ان دنوں اسی طرف تھا۔ عرفی فیضی کے ہمراہ اٹک تک جہاں شہنشاہ اکبر مقیم تھے، گیا تھا، کشمیر کی مہم بھی انھیں ایام میں شروع ہوئی، جب اس پر قبضہ ہو گیا۔ تو ۹۹۷ھ میں شہنشاہ اکبر اسکی سیر کو گئے، انکے ہمراہ ابوالفتح اور فیضی وغیرہ تھے۔ عرفی بھی حکیم مذکور کی معیت میں وہاں گیا۔ وہاں سے واپسی میں حکیم دردِ شکم میں مبتلا ہو گئے۔ حسن ابدال میں قیام ہوا ان کا مرض بڑھتا گیا۔ بادشاہ دو دفعہ عیادت کو گئے۔ آخر کو وہیں انتقال ہوا اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔ انھیں دنوں میں علامہ فتح اللہ شیرازی جو کشمیر کی سیر میں اکبر کے ہم رکاب تھے، راہی ملک بقا ہوئے اور حسن ابدال ہی میں مدفون ہوئے، عرفی ساؤجی نے تاریخ وفات نظم کی ؎

امروز دو علامہ ز عالم رفتند — رفتند و موخر و مقدم رفتند

چوں ہر دو موافقت نمودند بہم — تاریخ بشد کہ ہر دو باہم رفتند

عرفی نے یہ سانحہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس لئے اسکے دل پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا، جیسا کہ عرفی کے اس وقت کے قصیدہ سے صاف ظاہر ہے۔ اس تفصیل سے صاف پتہ چلتا ہے کہ عرفی کی شمالی ہند کی زندگی کا بیشتر حصہ کشمیر، پنجاب اور سندھ کی سیر و سیاحت میں گزرا اور آگرہ کا قیام محض ضمنی تھا۔ ممکن یہ ہے کہ وہاں سے جب

چہ احتیاج کہ گویم کہ مُردۂ عرفی را، چہ بر سر از ہوس مرگ ناگہاں آمد
دریں مصیبت عظمیٰ کہ دہر سنگیں دل زگریہ ہر سر مو چشم خوں فشاں آمد
برفت و لطفِ تو بر من گزاشت وایں بدل است بہ نزدِ عقل کہ تاواں آں زیاں آمد
تو آگہی کہ مرا از غروب ایں خورشید چہ گنج ہائے سعادت زیانِ جاں آمد

حکیم ابوالفتح اور خانِ خاناں سے بہت اتحاد تھا چنانچہ حکیم مذکور کی فرمائش سے اس نے ایک زوردار قصیدہ لکھا اور بقول صاحب میخانہ دکن بھیجا جس کے عوض میں خان خاناں نے لاکھ صلہ بھیجا۔ لیکن میخانہ کا قیاس صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ ۹۹۳ھ کے قریب یہ قصیدہ لکھا گیا ہو گا اور ان ایام میں خان خاناں کشمیر و سندھ کی فتوحات میں مشغول تھا۔ اس قصیدہ میں دونوں کی محبت و ارتباط کا ذکر نہایت لطیف پیرایہ میں ہوا ہے:-

ازاں نہ دیدہ ثنا گویمت کہ می بینم ترا و اورا یک تن بہ پیشم رو ماند
دلیل وحدتم ایں بس کہ مدح خود می خواست مرا بہ مدح تو فرمود گوہر افشانی

دیکھئے ایک سال کی مداحی میں کس قدر گوہر بے بہا اگھا گئے ہیں، معلوم ہوتا ہے ایسے شخص کا مذکور ہی جس سے بزرگوں کی محبت ہے۔ اور جس نے عرفی کی زندگی کا تجزیہ نہیں کیا ہے وہ اس بات کو جلد قبول نہیں کر سکتا کہ عرفی، حکیم مذکور سے کم و بیش ایک ہی سال وابستہ رہ سکا۔

خان خاناں اور عرفی تا ۹۹۹ھ حکیم ابوالفتح کے فوت ہو جانے پر عرفی نے خان خاناں کے ساتھ وابستگی پیدا کی۔ اگرچہ جیسا اوپر ذکر ہو چکا ہے خود حکیم مذکور کی زندگی ہی میں خان خاناں کی مدح میں اس نے قصیدہ لکھ بھیجا تھا لیکن اسوقت اس سے وابستہ نہیں ہوا تھا کیونکہ حکیم ہی اس کا مربی اور آقا تھا۔ بہرحال جو قصیدہ اس موقعہ پر لکھا ہے اس کا مطلع یہ ہے:

ز آسمان و زمین مژدہ ناگہاں آمد کہ آفتاب زمین تاج آسمان آمد

خان خاناں کے دربار میں پہونچ کر عرفی نے خاطر خواہ ترقی کی، مآثر رحیمی میں ہے[1]۔

"بہ اندک فرصتے بہ یمن تربیت و شاگردی و مداحی ایں دانائے روزگار پختگی کلام و ترقی مالا کلام در منظوماتش بہم رساند"

خان مذکور کے متوسلین میں نظیری، شکیبی، انیسی وغیرہ تھے۔ ان سے برابر مقابلہ رہتا تھا، اس لئے عرفی کا کلام روز بروز ترقی کرتا گیا۔ یہاں تک کہ تقرب و اختصاص میں وہ سب سے ممتاز ہوا، یہ بات اسی کو نصیب ہوئی کہ دربار میں جس جگہ چاہتا اور جس طرح چاہتا بیٹھ جاتا چنانچہ مآثر رحیمی میں ہے[2]:-

"الحق ایں شاعر را ایں رتبہ و حالت در ملازمت با رشایان زمان و اکابر دوراں بہم نہ رسیدہ بود، چناں کہ در ایام ملازمت تسلیم و کورنشے کہ در مظنہ تعارف ست کہ بہ عوض سلام بہ صاحبان می کنند بہ صاحب خود نمی کرد و بہر طور کہ می خواست در مجالس می نشست و اہل عالم تقدیم او را قبول نمودہ اند"

عرفی خان خاناں کے ساتھ سفر و حضر میں رہا چنانچہ ۹۹۹ھ میں جب خان خاناں نے مرزا جانی بیگ ترخان والی ٹھٹھہ پر حملہ کیا تو عرفی اس کے ساتھ رہا اور غالباً اسی سفر سے واپسی میں اسی سال شوال کے مہینہ میں لاہور میں انتقال کیا۔

---

[1] و [2] در ص ۲۷۳ ب

خان خاناں نے عرفی کے ساتھ جو فیاضیاں کیں اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ ایک قصیدہ پر ستر ہزار روپے انعام دلوائے۔

عرفی اور اکبر عرفی نے خان خاناں اور ابو الفتح کے سوا کسی امیر کی مدح سرائی گوارا نہ کی، کیونکہ مدح سرائی سے اسے طبعاً نفرت تھی جیسا کہ خود کہتا ہے :۔

قصیدہ نظم ہوسس پیشگاں بود عرفی — تو از قبیلۂ عشقی وظیفہ ات غزل است

لیکن فرمانروائے وقت سے یہ بے نیازی ممکن نہ تھی۔ اس لئے خود اپنی خواہش سے یا خان خاناں اور ابو الفتح کی فرمائش سے اکبر کی مدح میں اس نے متعدد قصاید لکھے۔ معلوم نہیں کہ اس کو شاہی دربار کی باریابی حاصل ہوئی یا نہیں کیونکہ تمام تذکرہ اس بارہ میں خاموش ہیں صرف بدایونی نے لکھا ہے کہ اس کی رسائی ہوئی تھی، چنانچہ بادشاہ کے ہمراہ ۹۹۷ھ میں کشمیر گیا تھا اور کسی موقع پر بادشاہ نے ایک گھوڑا انعام میں دیا تھا لیکن عرفی نے بجائے اظہار تشکر کے اُلٹے گھوڑے کی ہجو کی۔

شاہنشہا حقیقت اسپے کہ دادۂ — بشنو ز لطف تو بر سانم بعزِ عرض

ہستم بر او سوار و بہ معنی پیادہ ام — گامے بطول می زدم اکنو زنم بعرض

کشمیر کے سفر میں فیضی بھی بادشاہ کے ہم رکاب تھا۔ ممکن ہے کہ پرانے تعلقات کی بنا پر فیضی کی معیت میں عرفی کشمیر کی سیر کو چلا گیا ہو۔

عرفی اور شاہزادہ سلیم خان خاناں اور اکبر کے علاوہ عرفی نے کسی اور آستانہ کی "ناصیہ سائی" کی تو وہ شاہزادہ سلیم ہے، یہ معلوم نہیں کہ عرفی نے شاہزادہ سے رابطہ کب پیدا کیا۔ نہ تذکروں میں اس کے بارہ میں کچھ لکھا ہے اور نہ قصیدوں سے کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بہر حال شمالی ہندوستان میں آکر اس نے شہزادے سے ارتباط پیدا کیا ہوگا۔ عرفی کی تاریخ زندگی میں اس واقعہ کو جتنی اہمیت حاصل تھی اس سے زیادہ اہم بنا کر پیش کیا گیا ہے، مولانا شبلی نے اس میں بہت کافی حصہ لیا ہے، چنانچہ شعر العجم میں بار بار عرفی کو شہزادہ سلیم کا عاشق قرار دیا گیا ہے۔ مجھے مولانا سے اختلاف ہے اس لئے میں ان کے اقوال کو ہر حیثیت سے جانچنے کی کوشش کروں گا۔

اس سے قبل مولانا کا وہ قول لکھا جا چکا ہے جس میں انھوں نے عرفی کا غائبانہ عشق بیان کیا ہے۔ اگر اس میں کسی قسم کی حقیقت ہوتی تو عرفی کسی دربار یا کسی امیر سے تعلقات کیوں پیدا کرتا۔ سیدھا ہندوستان آتا اور شاہزادہ سے متعلق ہو گیا ہوتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہ احمد نگر آیا۔ وہاں قدر دانی نہ ہو سکی تو شمالی ہندوستان آیا اور فیضی سے تعلقات پیدا کئے۔ پھر جب اس سے نہ نبھ سکی تو حکیم ابو الفتح نے اس کو نوازا اور آخر میں خان خاناں نے اس پر احسانات کئے۔ درمیان میں کبھی کبھی اس نے بادشاہ وقت اور شہزادہ دونوں کی مدح سرائی بھی کر دی، اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان دونوں سے تعلقات کی نوعیت محض ضمنی اور ثانوی تھی۔ دوسری جگہ مولانا[1] رقم طراز ہیں :۔

"عرفی ایک طرف نکتہ سنج، نکتہ شناس اور ذوق عرفان سے آشنا تھا، دوسری طرف شباب میں نہایت خوش رو اور حسین اور لوگوں کا "منظور نظر" رہ چکا تھا۔ ہندوستان میں آیا تو شاہزادہ جہانگیر پر عاشق ہوا۔ ان اسباب کی بنا پر وہ عشق و محبت کی ایک ایک ادا سے واقف تھا۔"

---

[1] شعر العجم ج ۳ ص ۱۱۱

مولانا کا یہ قول محض طبع زاد اور خود ساختہ ہے۔ کسی تذکرہ میں نہ اس کے حُسن و خوش روئی کا بیان ہے اور نہ اسکے "منظورِ نظر" رہنے کا۔ شعر العجم میں جن جن تذکروں کا ذکر آیا ہے وہ سب میرے پیش نظر ہیں۔ ان میں سے کسی میں یہ واقعہ مذکور نہیں، اس غیر ذمہ دارانہ بات کی بظاہر دو وجہیں ہو سکتی ہیں (۱) مولانا کو اس کے شباب کی کوئی تصویر ہاتھ لگ گئی ہو اور اس کو دیکھ کر انھوں نے دو نتیجے نکالے یعنی وہ دوسروں کا "منظورِ نظر" رہ چکا تھا اور پھر خود جہانگیر کا عاشق ہوا۔ (۲) انھوں نے عرفی کے کلام کا مطالعہ کیا تو وہ عشق و محبت کی ایک ایک ادا سے واقف نکلا اس پر مولانا نے مذکورۂ بالا حکم لگا دیا — ایک اور مقام پر مذکور ہے[1]:۔

"تمام تذکرے متفق ہیں کہ عرفی شاہزادہ مذکور کا جاں دادہ ہے، یہ امر اگرچہ بظاہر خلاف قیاس ہے لیکن عرفی کے قصاید میں بلاشبہ یہ جھلک پائی جاتی ہے۔ شاہزادہ موصوف کی شان میں اس کے جو قصیدے ہیں ان کے دیکھنے سے صاف نظر آتا ہے کہ یہ اور کوئی جوش ہے جس کا رنگ مداحی کے لباس میں جھلک رہا ہے"

اگر اوپر کے بیان میں "تمام" کے بجائے "کچھ" ہوتا تو یہ بیان کسی قدر درخور اعتنا ہوتا۔ کیونکہ تمام تذکروں میں عرفی کی فریفتگی کا ذکر نہیں پایا جاتا۔ معاصر تذکرہ نویس سب کے سب خاموش ہیں، نہ مآثر رحیمی میں یہ واقعہ مذکور ہے، نہ عرفات العاشقین میں، نہ میخانہ میں اس کی طرف اشارہ ہے، نہ بدایونی میں، نہ خلاصۃ الاشعار میں یہ بات درج ہے اور نہ ہفت اقلیم میں، یہ چھ تذکرے عرفی کی تاریخ زندگی میں بہت اہمیت رکھتے ہیں — متاخرین میں والہ داغستانی پہلا تذکرہ نویس ہے جس کا بیان قابل توجہ ہے:۔

"او با شاہزادہ سلیم، خصوصیت و محبت مفرط داشتہ چنانچہ بعضے بہ عشق شاہزادہ متہمش کردہ اند"

اس بیان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ خود مؤلف کو اس واقعہ سے انکار ہے، جو لوگ اس کو شاہزادہ کا عاشق سمجھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ یہ محض تہمت و الزام بیجا ہے۔ بات یہ ہے کہ شاہزادہ سے اس کو بے حد محبت و خصوصیت تھی اور محبت و خصوصیت عشق مذموم ہی کا لازمی نتیجہ نہیں ہوا کرتا۔

بتلا بھی کچھ اسی طرح کا راگ الاپتا ہے لیکن اس کا بیان بہت واضح نہیں ہے:۔

"با شاہزادہ سلیم خصوصیت و محبت مفرط داشتہ"

اول تو یہ "جملہ والہ" کے بیان سے ماخوذ ہے، دوم اس میں عشق و عاشقی کا مطلق ذکر نہیں ہے اور نہ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ شاہزادہ کا عاشق تھا اور نہ یہ کہ یہ الزام محض ہے۔

مؤلف مراۃ آفتاب نما لکھتا ہے:۔ "حسادش بہ عشق شاہزادہ متہم کردہ" — اس سے صاف ظاہر ہے کہ شاہزادہ سے عشق محض الزام تھا جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

جو تذکرے میرے پیش نظر ہیں ان میں صرف تین متذکرہ بالا تذکرے ایسے ہیں جن میں شاہزادہ سے خصوصیت و محبت کا بیان ہے، یہ تو آپ نے دیکھ ہی لیا کہ ان میں سے کسی کے بیان سے یہ ہرگز مترشح نہیں ہوتا کہ عرفی کو شاہزادہ سے عشق تھا۔ اگر اس نے تو صاف صاف اور ایک نے دبی آواز میں اس بات سے قطعی انکار کیا ہے، پھر اب وہ کون سے تمام کتابیں یا تمام تذکرے ہیں جنکی

---

[1] شعر العجم ج ۳، صفحہ ۸۹

بنا پر مولانا شبلی جیسے مورخ و محقق نے "عرفی" کو مورد الزام ٹھہرایا۔

اب ذرا ایک قصیدے کے چند اشعار کو جانچ لیجئے جن کو مولانا شبلی صرف جھوٹے عشق اور ہوس ناکی کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں[1]:- "عرفی کو اس خوش قسمتی پر ناز ہو سکتا ہے کہ شہزادہ نے خود اس کو یاد کیا اور دربار میں بلا کر قصیدہ لکھنے کی فرمایش کی عرفی جس شان سے دربار پہونچا ہے اور شاہزادہ نے جس طرح نگاہ پنہاں سے باتیں کی ہیں اس کی تصویر خود عرفی نے نہایت خوبی سے کھینچی ہے:-

کہ ناگہاں ز درم در رسید مژدہ دہے	چناں کہ از چمن طالعم بہ مغز شمیم
چہ گفت گفت کہ اے مخزن جواہر قدس	چہ گفت گفت کہ اے مطلب بہشت نعیم
بیا کہ از گہرت یاد می کند دریا	بیا کہ تشنہ لبت را طلب کند تسنیم
بہ رہ فتادم و گشتم چناں شتاب زدہ	کہ دست اہل کرم در نثار گوہر و سیم
مرا بچو دوش بدوش ادب بدید استاد	بلطف خاص بدل کرد التفات عمیم
رموز کورنش و تسلیم را ادا کردم	بباب مردم دانا و بذلہ سنج ندیم
نگفت و من بشنودم ہر انچہ گفتنی داشت	کہ در بیان نگہش کرد بر زباں تقدیم
لبش چو نوبت خویش از نگاہ باز گرفت	فتاد سامعہ در موج کوثر و تسنیم

دوسری جگہ پھر رقمطراز ہیں[2]:- "چونکہ عرفی جہانگیر کا عاشق تھا ہمہ تن شوق اور بے تابی کے عالم میں گیا، جہانگیر نے نگاہ لطف سے دیکھا اور اشاروں میں باتیں کیں پھر قصیدہ لکھنے کی فرمایش کی"۔

میری رائے ناقص میں مذکورہ بالا اشعار میں کوئی شعر عشق و عاشقی سے دور کا بھی لگاؤ نہیں رکھتا۔ البتہ یہ بہترین قسم کی شاعری اور ایک نفیس واقعہ کی زندہ تصویر ہے، ان کے مطالعہ سے حالات کا بعینہ سماں نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ دوسرے اور تیسرے شعر پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ شاعر نہایت کامیابی سے اپنی تعریف کرنے میں عہدہ برآ ہوا ہے۔ اپنے کو "مخزن جواہر قدس" اور "مطلب بہشت نعیم" قاصد کی زبان سے کہلواتا ہے۔ پھر اسی کی زبان سے اپنے کو "گہر" اور سلیم کو "دریا" قرار دیتا ہے۔ چوتھے شعر میں "تیز رفتاری" کو اہل کرم کے "دست سخا" سے مقابلہ کرنا کس قدر عمدہ اور برمحل ہے۔ "التفات عمیم" کا "لطف خاص" میں بدل دینے کی وجہ بھی ظاہر کرتا ہے۔ نگاہ کا زبان پر پیش دستی کرنا بالکل فطری ہے۔ اس کا بیان جس انداز سے کیا ہے اسکی نظیر مشکل سے ملے گی۔ پھر ہونٹوں کے بیان سے محظوظ ہونے کی حالت کو کامیابی کے ساتھ نظم کرنا صحیح نگاری کی دلیل ہے۔

دوسری چیز جو مولانا شبلی نے عرفی کا عشق مذموم ثابت کرنے کے لئے پیش کی ہے وہ عرفی کا ایک قطعہ ہے۔ یہ قطعہ سعدی کے ایک قطعہ کا جواب ہے جس میں یہ مضمون بندھا تھا کہ اس شاعر کو عاشقی کا نام نہ لینا چاہئے جو قصیدہ میں دو چار شعر عشقیہ کہکر مداحی شروع کر دیتا ہے، عرفی کے قطعہ کا مفہوم خود مولانا کی زبان قلم سے یوں ادا ہوا ہے:-

---

[1] شعر العجم ج ۳، صفحہ ۸۹۔ [2] شعر العجم ج ۳، صفحہ ۱۰۹

"سعدی گو ممدوح کو معشوق پر ترجیح نہیں دیتے لیکن بہرحال معشوق کے علاوہ ان کا کوئی اور ممدوح بھی ہے"
لیکن میرا تو ممدوح بھی وہی ہے جو معشوق ہے"

اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ جب یہ قطعہ شاہزادہ سلیم سے متعلق نہیں ہے تو پھر اس میں جو لطیف اشارہ ہے اس کو شاہزادہ مذکور کی معشوق کی طرف کیوں سمجھا جائے۔ دوم یہ کہ شاعر اپنے ممدوح کے لئے معشوق کا لفظ عموماً استعمال کیا کرتے تھے۔ فارسی شاعری میں اس کا عام طور پر رواج ہو چکا تھا۔ مثلاً اسی دور کے ایک دوسرے ممتاز شاعر ظہوری نے اپنے ممدوح ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸ - ۱۰۳۷) کے لئے صدہا شعروں میں نہ صرف "معشوق" اور "محبوب" جیسے الفاظ استعمال کئے ہیں بلکہ اس کی چشم، رخسار، ابرو، کاکل، چال وغیرہ کی تعریف مختلف انداز اور عنوان سے کی ہے۔ باوجود اس کے یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ہوس باز عاشق تھا۔ فارسی زبان کے ماہر اور ادیب کا بغیر کسی خارجی روایت کے کسی شاعر کے کلام کو اس کے ذاتی عشق و بوالہوسی کا لازمی نتیجہ سمجھنا حیرت انگیز ہے، عرفی کی بد دماغی اور ناقابل برداشت غرور کی بہتوں نے شکایت کی ہے، اور اسی وجہ سے دربار اکبری میں اس کے بہت سے دشمن پیدا ہو گئے تھے لیکن اس کے باوجود فیضی جو اس کا سب سے بڑا حریف تھا اس کی شریف النفسی کی تعریف اس طرح کرتا ہے:۔ "واز تہذیب اخلاق چہ گوئید کہ در فضائل نہاد شیراز ذاتی می باشد نہ کسبی"

اگر وہ رند و اوباش ہوتا تو اول اس کی رسائی دربار اکبری میں نہ ہوتی، اگر ہوتی بھی تو اس کی فضیحت بری طرح ہو جاتی۔ دوم یہ کہ زبردست حریف جن کی تعداد کم نہ تھی یقیناً اس کی گندگی کو اچھالتے، لیکن معاصرین کی خاموشی جن سے اس کی چشمک بھی تھی بلکہ بعض کی ستائش اس بات کی بین دلیل ہے کہ وہ خصایل رذیلہ سے پاک تھا۔ چنانچہ خود مولانا شبلی نے اقرار کیا ہے کہ بخلاف اور شعراء کے وہ رند و اوباش نہ تھا۔ ایک بار کسی نے اس پر فسق کا الزام لگایا تھا جس کا اس کو بے حد صدمہ ہوا، چنانچہ کہتا ہے:۔

اہل دنیا ہمگی تہمت گیرند و فساد عیسیٰ ایں را متحمل شدہ مریم برداشت

ایسے بلند اخلاق انسان اور بے بدل شاعر کو بغیر کسی سند کے ایک سنگین الزام کا مورد ٹھہرانا بہت بڑا اخلاقی جرم ہے۔

قیام ہند پر اجمالی نظر

تفصیل بالا سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ عرفی کی مختصر زندگی کا زیادہ حصہ ایران ہی میں گزرا عمر کا کچھ حصہ کسب علوم میں اور کچھ شاعروں کے دنگل میں بسر ہوا، وہیں وہ بڑھا۔ پلا۔ پروان چڑھا۔ وہیں اس کی شاعری چمکی اور اس کی روشنی دور و نزدیک پہونچی، وہیں اس نے غیرتی، محتشم، وحشی جیسے شعراء سے مقابلہ کیا، لیکن اسکے کلام کا بیشتر حصہ جو اس کی شہرت کی اصل وجہ ہے، ہندوستان کی چار سالہ زندگی کا نتیجہ ہے، کیونکہ جیسا معلوم ہے اس کے جزء ہزار اشعار جو ایران کے قیام میں کہے گئے تھے ضایع ہو گئے، موجودہ دیوان کا تقریباً کل حصہ ہندوستان کے قیام میں معرض داد میں آیا تھا شاید تو تمام یہیں کے ہیں البتہ غزلیات کا کچھ حصہ ممکن ہے کہ پرانا بھی ہو۔ اس کے کلام پر نظر ڈالنے سے مطالعہ کرنے والا حکم لگا دیگا کہ اس شاعر کی زندگی تمام تر ہندوستان میں گزری، چنانچہ براؤن جیسے محقق نے لکھ دیا ہے کہ "اگرچہ وہ شیراز میں پیدا ہوا اور وہیں اسکی پرورش بھی ہوئی لیکن اس کی مختصر زندگی زیادہ تر ہندوستان میں بسر ہوئی"، کیونکہ "کم سنی ہی میں وہ ہندوستان چلا آیا تھا"

عرفی ۹۹۴ھ سے ۹۹۹ھ تک ہندوستان میں رہا، ان چار پانچ سالوں میں اس کو یکسوئی غالباً بہت ہی کم نصیب ہوئی ہوگی۔ ہندوستان کے بیشتر حصوں کا اس نے اس زمانہ میں سفر کیا جب کہ آمد و رفت کی آسانیاں بہت کم تھیں۔ ۹۹۴ھ میں احمد نگر میں تھا۔ اسی سنہ کے آخر میں یا ۹۹۵ھ کے شروع میں وہ فتحپور سیکری پہونچا، اسی سال جبکہ فیضی، یوسف زئی پٹھانوں کی مہم پر سرحد کی طرف روانہ ہوا تو وہ بھی اس کے ہمراہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ دنوں اس نے اٹک میں بھی قیام کیا ہوگا کیونکہ اکبر بادشاہ بھی ان دنوں کشمیر کی مہم کے قبل یہیں آگئے تھے۔ یہیں سے دوسرے سال اکبر، کشمیر کی سیر کو گئے عرفی اور فیضی بادشاہ کے ہمرکاب تھے۔ دونوں نے کشمیر کی تعریف میں قصیدے لکھے۔ اسی سال یعنی ۹۹۷ھ ہی میں اکبر، پشاور میں تھے، فیضی بھی اس کے ساتھ تھا ممکن ہے عرفی بھی رہا ہو۔ لیکن اسی سال حکیم ابوالفتح فوت ہوا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ عرفی آگرہ واپس آگیا ہو۔ ۹۹۹ھ میں خان خاناں کے ساتھ وہ سندھ گیا، وہیں سے واپسی میں لاہور پہونچ کر شوال ۹۹۹ھ میں راہی ملک بقا ہوا۔

ایسی غیر مطمئن زندگی میں اسے کیا کیا پریشانیاں نہ اٹھانا پڑی ہوں گی۔ باوجود اس کے اس نے ایسے ایسے جواہر پارے چھوڑے ہیں کہ رہتی دنیا تک ان کی روشنی دل کی آنکھوں کو جلا بخشتی رہے گی۔ اگر عرفی کی زندگی کے یہ چار سال نکال دئے جائیں تو اسکی حیثیت معمولی انسان سے کسی حالت میں بھی بلند نہیں رہ جاتی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر کچھ دنوں وہ اور زندہ رہ جاتا تو دنیا کے عظیم ترین شاعروں کی صف اول میں جگہ پاتا۔

وفات سنہ ۹۹۹ھ

عرفی کی وفات اور سنہ وفات کے بارہ میں مختلف قسم کی روایتیں ہیں۔ تمام تذکروں میں اس کی وفات کا سنہ ۹۹۹ھ ہجری قرار دیا گیا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ معتبر نہاوندی، ابوالفضل اور بدایونی کے اقوال ہیں۔ مآثر رحیمی میں لکھا ہے کہ تقی اوحدی نے اس کی تاریخ وفات "ہادی کلام عرفی شیرازی" سے نکالی ہے۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ تقی بھی نہاوندی کے ہم نوا ہیں۔ "ہمیشہ بہار" اور "ریاض الشعراء" میں بھی یہی تاریخ منقول ہے۔ لیکن اس کے مؤلف کا نام نہیں درج ہے۔ تعجب ہے کہ تفرشی تذکرہ میں عرفی کے حالات کے ذیل میں نہ اس کی تاریخ وفات ہی لکھی ہے اور نہ مذکورۂ بالا تاریخی قطعہ ہی مندرج ہے۔ تقی اوحدی کا یہ قطعہ یا عرفی کی وفات کے ۱۶ سال بعد ہندوستان میں لکھا گیا کیونکہ مؤلف کے ورود ہند کی تاریخ ۱۰۱۵ھ ہے، یا ایران میں مرتب ہوا۔

ابوالفضل نے اکبر نامہ میں عرفی کا انتقال ۹۹۹ھ کے ذیل میں لکھا ہے۔ بدایونی نے بھی یہی تاریخ درج کی ہے اور ساتھ ہی دو تاریخیں بھی لکھی ہیں "دشمن خدا" "جوانا مرگ شدے"۔ ان دونوں سے یہی سنہ برآمد ہوتا ہے۔ کلمات الشعراء اور ہمیشہ بہار میں عرفی کے کسی شاگرد کا فقرۂ تاریخ (اُستاد البشر) دیا ہے۔ مولانا آزاد نے آیۂ کریمہ "متکئین فیہا علی الارایک" سے اس کے انتقال کی تاریخ نکالی ہے۔

ان کے علاوہ خان آرزو، ابراہیم خلیل، والہ وغیرہ بھی اسی قول کی تائید کرتے ہیں۔ سبھوں نے یہ لکھا ہے کہ انتقال کے وقت اسکی عمر ۳۶ سال کی تھی۔ صرف مراۃ آفتاب نما اور نشتر عشق میں اس کی عمر ۳۵ سال کی تجویز ہوئی ہے۔ پروفیسر براؤن اور مولانا شبلی نے

اس کی وفات ۹۹۶ھ میں بیان کی ہے اور عمر ۳۶ سال تجویز کی ہے۔

بہرحال تاریخی قطعوں، ہم عصر شہادتوں، اور دوسرے مشہور تذکرہ نگاروں کے بیان سے یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ عرفی کی وفات کا سال ۹۹۹ھ ہے، مگر دو معاصر مؤلفوں کے قول نے ذرا اشکال پیدا کر دیا۔ ان میں ایک تقی کاشی، مؤلف خلاصۃ الاشعار اور دوسرے عبدالنبی صاحب میخانہ ہیں۔ اول الذکر نے عام رائے کے خلاف اس کا سنہ وفات ۱۰۰۲ھ قرار دیا ہے، البتہ میخانہ کے نسخوں میں اختلاف ہے، ایک نسخہ میں یہی تاریخ یعنی ۱۰۰۲ ہجری درج ہے، مگر دوسرے نسخہ میں ۱۰۲۰ھ لکھ کر بعد کو ۱۰۰۲ھ بنایا گیا ہے۔

اس کے علاوہ یہ قول دونوں نسخوں میں بغیر اختلاف موجود ہے کہ (عرفی) کی عمر ابھی ۴۰ سال بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ فرشتۂ اجل نے رشتۂ زندگی قطع کر ڈالا، عرفی کی تاریخ پیدائش ۹۶۳ھ تجویز کی گئی ہے اس لحاظ سے ۱۰۰۲ھ میں اس کی عمر ۳۹ سال کی ہوتی ہے۔

عرفی نے لاہور میں انتقال کیا۔ بعض لوگ اس کی وفات کا سبب عارضۂ پیچش قرار دیتے ہیں، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شاید اسے زہر دیا گیا، زہر دینے کا واقعہ ریاض الشعراء، تذکرہ مبتلا اور مراۃ آفتاب نما میں مذکور ہے، تینوں کے بیان سے صاف طور سے ظاہر ہے کہ شہزادہ سلیم سے بے حد خصوصیت تھی۔ بعض لوگوں کی نظر میں یہ محبت اس درجہ کھٹکی کہ عرفی کو بدنام کر ڈالا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عین جوانی میں حاسدوں نے اسے زہر دیدیا۔ اگرچہ اس پر تفصیلی بحث گزر چکی ہے کہ عشق کا قصہ سراسر غلط اور خلاف قیاس ہے، لیکن زہر دینے کے بیان کی تردید کے لئے بظاہر میرے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ ممکن ہے واقعۃً ایسا ہی ہوا ہو۔ لیکن معاصر مؤلفین کی خاموشی کی وجہ سے ہم اس کو تسلیم نہیں کر سکتے۔

ہڈیوں کی منتقلی تمام تذکرے متفق ہیں کہ عرفی لاہور ہی میں مدفون ہوا، ہمیشہ بہار میں ہے کہ میر حبیب اللہ کے مقبرے میں اس کو دفن کیا گیا تھا۔ ریاض میں لکھا ہے کہ چند سال کے بعد کوئی درویش کسی اور بزرگ کے دھوکے میں اس کی ہڈیاں قبر سے نکال کر نجف لے گیا اور وہیں دفن کیں۔ لیکن یہ غلط ہے اس وجہ سے کہ اس کتاب میں رونقی وہ قطعۂ تاریخ منقول ہے جو اس نے اس واقعہ کے لئے نظم کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب کسی کی لاش دھوکے سے نکالی گئی تو پھر اس پر اہتمام کے ساتھ قطعۂ تاریخ لکھا جانا سراسر بے معنی ہے، دوسرے یہ کہ تمام تذکروں میں یہ بیان ہے کہ ایک قلندر کے توسط سے اس کی ہڈیاں نجف اشرف پہونچیں ان سب میں مآثر کا بیان[1] بہت صاف ہے:۔

"میر صابر اصفہانی نے جو ایک اچھا خاصہ شاعر ہے اور غیاث بیگ طہرانی کی خدمت میں ہے، ایک درویش کو رقم کر دی کہ مولانا عرفی کی لاش لاہور سے نجف اشرف پہونچا دے، اس بزرگ کی عرفی کی لاش کھود دی، اس کو مشہد لے گیا اور وہاں دو ماہ بطور امانت رکھا پھر نجف اشرف لے گیا۔ رشیدائے کاشی جو اس دور کا ایک مشہور شاعر ہے ۱۰۲۸ھ میں نجف میں موجود تھا۔ وہ ایک شخص سید حسین نقیب نجف کے پاس گیا اور مولانا کی لاش کو دفن کرنے کے لئے زمین کا طالب ہوا، وہ اپنے ارادہ میں کامیاب ہوا اور ۳۰ سال کے بعد عرفی کی لاش کے ریزے مقام "بحیرہ" میں دفن ہوئے۔ اس کے بعد سید حسین نے جشن قایم کر کے غربا میں خاصی رقم تقسیم کی انکا ارادہ

---

[1] ورق ۴۷ ب

ایک مقبرہ طیار کرانے کا ہے۔"

اس کے بعد مولانا رونقی کا متذکرہ بالا قطعہ تاریخ ہے، جس میں "بکاوش مژہ از گور تا بنجف آمد" سے اس واقعہ کی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ بہرحال عرفی کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔

بکاوش مژہ از گور تا بنجف بردم اگر بہ ہند ہلاکم کنی و گر بہ تتار

میخانہ میں ایک دوسرا قول پایا جاتا ہے جس کا درج کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا:۔

"۱۰۲۷ھ میں ملک الشعرائے خراسان مرزا فضیحی نے ایک شخص کو لاہور بھیجا کہ وہ عرفی کی ہڈیاں مشہد مقدس لے آئے۔ لیکن اس شخص کے لاہور پہونچنے کے دس روز قبل ہی میر صابر اصفہانی ہڈیاں نجف اشرف پہونچا چکا تھا۔"

اس واقعہ کی تاریخ میں کسی قدر اختلاف ہے، مآثر کے بیان کے مطابق ۳۰ سال بعد یعنی ۱۰۲۹ھ میں اس کی ہڈیاں نجف اشرف میں مدفون ہوئیں، اس کی تائید مجمع النفائس، کلمات الشعراء، ہمیشہ بہار اور مخزن الغرائب وغیرہ تذکروں سے ہوتی ہے لیکن رونقی کے قطعہ سے جو بغیر اختلاف سب کتابوں میں مندرج ہے ۱۰۲۷ھ برآمد ہوتا ہے۔ وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ جب یہ قطعہ مآثر میں موجود ہے تو پھر اس واقعہ کو ۱۰۲۹ھ کا کیوں قرار دیا۔ اس میں مزید یہ بھی مذکور ہے کہ ۱۰۲۸ھ میں رشید اوہاں موجود تھا۔ حالانکہ خود مؤلف مآثر کے بیان کے مطابق اس تذکرہ کے اختتام کا سال ۱۰۲۵ھ ہے، ۱۵ جمادی الثانی ۱۰۲۶ھ میں اس کا مقابلہ کرکے کچھ حاشیے اور خاتمہ کا اضافہ کے ساتھ یہ کتاب خواجہ سلطان محمد اصفہانی کو پیش کی گئی۔ اس کے بعد ۲۳ رجب ۱۰۳۱ھ کو خواجہ سے لے کر اپنے مخدوم قاضی عبدالعزیز کے پاس بھیجی گئی لیکن مقابلہ نہ ہو سکا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس میں جمادی الثانی ۱۰۲۶ھ تک کے واقعات ہو سکتے ہیں۔ پھر ۱۰۲۹ھ کا واقعہ کیونکر مندرج ہوا یا اگر یہ واقعہ ۱۰۲۷ھ ہی کا ہو پھر بھی اس میں درج نہیں ہو سکتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ فوقتاً فوقتاً اس کتاب میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔

نشتر عشق میں رونقی کا قطعہ درج ہے لیکن اس میں لکھا ہے کہ ۲۸ سال بعد عرفی کی ہڈیاں دوبارہ دفن ہوئیں۔ مگر میخانہ میں یہ قطعہ مندرج نہیں — اوپر کی بحث سے بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ اس واقعہ کو ۱۰۲۷ھ کا سمجھنا چاہئے کیونکہ رونقی کے قطعہ سے یہی تاریخ برآمد ہوتی ہے — عرفات العاشقین میں بھی اس کی وفات لاہور میں بتائی گئی ہے اور مزید یہ بھی لکھا ہے کہ وہیں اسکا مرقد بھی ہے۔ امن میں عرفی کی ہڈیوں کے نجف لے جانے کے واقعہ کو بالکل نہیں لکھا گیا۔ مؤلف ایسا کرنے میں حق بجانب ہے کیونکہ یہ تذکرہ ۱۰۲۲ھ اور ۱۰۲۴ھ کے درمیان لکھا گیا (حالانکہ اختتام کی تاریخ یہ ہے — بدو سال ایں نوی تمام شدہ۔ جس سے ۱۰۲۰ھ برآمد ہوتا ہے) اور یہ واقعہ اس کے تین سال بعد وقوع پذیر ہوا۔

عرفی نے انتقال کے وقت حسب ذیل رباعی لکھی:۔

عرفی دم نزع است و ہماں مستی تو آیا بچہ مایہ رخت بربستی تو
فرداست کہ دوست نقد فردوس بکف جویائے متاع ست و تہی دستی تو

ترتیب دیوان تمام تذکرے معہ مآثر رحیمی کے متفق ہیں کہ عرفی نے خود ۹۹۶ھ میں ایک دیوان مرتب کیا جس میں ۲۶ قصیدے ۲۷۰ غزلیں اور ۷۰۰ شعر کے قطعات اور رباعیاں تھیں، اس دیوان کی خود ہی تاریخ کہی :-

ایں طرفہ نکات سحری و اعجازی — چوں گشت مکمل بہ رقم پردازی
مجموعہ طراز قدس تاریخش یافت — اول دیوان عرفی شیرازی

مگر میخانہ میں لکھا ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں کوئی دیوان ترتیب نہیں دیا تھا۔ مرنے کے بعد اس کے ایک دوست نے مروجہ دیوان مکمل کیا۔ جس میں ساڑھے بارہ ہزار اشعار تھے۔ بہرحال یہ غلط ہے۔

عرفی نے جو دیوان مرتب کیا تھا وہ اس کی زندگی کا آخری کلام تھا۔ اس سے پہلے ۲ ہزار شعر کہے تھے۔ وہ بدقسمتی سے ضایع ہوگئے۔ اس کے ماتم میں ایک پر درد غزل لکھی جو تمام تذکروں میں منقول بھی ہے :-

عمر در شعر بسر کردہ و در باختہ ام — عمر در باختہ را بار دگر باختہ ام
رصد شرع ہنر چوں نہ شود محوکہ من — شش ہزار آیت احکام ہنر باختہ ام
گفتہ گر شد ز کفم، شکر کہ ناگفتہ بجاست — از دو صد گنج یکے مشت گہر باختہ ام

آخری شعر میں کہتا ہے کہ اگر کہا ہوا جاتا رہا تو پروا نہیں، شکر ہے کہ بن کہا ہوا تو موجود ہے۔

عرفی جیسے خوش نصیب دنیا میں بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ مرنے کے بعد اس کی ہڈیوں کے ریزے نجف اشرف پہونچے تھے اور اسی طرح انتقال کے ایک عرصہ بعد اس کا دیوان بڑے اہتمام کے ساتھ مدون ہوتا ہے، مآثر رحیمی کے بیان کے مطابق مرتے وقت اپنا دیوان جو اس کے ہاتھ کا مسودہ تھا۔ خان خاناں کے کتاب خانہ میں تدوین کی غرض سے بھیجدیا تھا۔ چنانچہ اسکی وفات کے ۲۵ سال بعد ۱۰۲۴ھ میں خان موصوف نے محمد قاسم سراجا کو اس کام پر مامور کیا، اس نے سال بھر کی محنت شاقہ کے بعد دیوان کی ترتیب پوری کی، اس میں کل ۱۴ ہزار اشعار تھے۔ موصوف نے محمد قاسم کو انعام سے مالا مال کیا سراجا نے ایک قطعہ میں ان واقعات کا ذکر کیا ہے جو مآثر میں منقول ہے اس قطعہ کے ذیل کے شعر میں تاریخ بھی موجود ہے :-

از خرد خواستم چو تاریخش — گفت ترتیب دادہ دیوانش

"ترتیب دادہ" سے ۱۰۲۶ھ برآمد ہوتا ہے۔ صاحب مآثر نے اس پر دیباچہ لکھا تھا جس میں عرفی کی زندگی کے دلچسپ واقعات قلم بند کئے تھے افسوس کہ اب نایاب ہے۔

نشتر عشق میں ناظم تبریزی کے حوالے سے یہ واقعہ کسی قدر مختلف طور سے بیان ہوا ہے، ناظم نے لکھا ہے کہ مرنے سے قبل اس نے اپنا دیوان خان خاناں کو دیا کہ اس کی تدوین ہوجائے۔ ۱۰۳۰ھ میں اس نے ایک محرر کو اس کام پر مقرر کیا، وہ مسودات لے کر رفو چکر ہوگیا۔ ناظم نے حسن اتفاق سے اسے کہیں دیکھا اور مسودات واپس لینے میں کامیاب ہوگیا۔ اس میں ۱۵ ہزار اشعار تھے۔

بہرحال جو دیوان خان خاناں کے زیر اہتمام مدون ہوا اس میں بقول ناظم ۱۵ ہزار اشعار، اور بقول صاحب میخانہ ساڑھے بارہ ہزار اور بقول دیگر تذکرہ نویسان ۱۴ ہزار اشعار تھے۔ اس میں آخری قول صحت سے قرین ہے۔ کیونکہ اولاً تمام تذکروں سے اسکی تصدیق ہوتی ہے، ثانیاً مآثر رحیمی میں بھی یہی موجود ہے ثالثاً خود سراجا کا تاریخی قطعہ اس امر کا موید ہے، انھیں وجوہ سے دیوان کی ترتیب کی تاریخ بجائے ۱۰۳۰ھ کے ۱۰۲۶ھ سمجھنا چاہئے۔ ۱۰۲۶ھ مآثر کی تاریخ تصنیف ہے جس میں یہ قول پورے اعتماد کے ساتھ مذکور ہے۔

مولانا شبلی نے بہارستان سخن کے حوالے سے لکھا ہے کہ عرفی کا ضائع شدہ کلام بھی حاصل ہوا جو دیوان میں داخل کر دیا گیا مولانا کے نزدیک یہ بیان قرین قیاس ہے۔

کیرکٹر

عرفی ایک بلند ہمت، غیور اور خود دار انسان تھا۔ اس کے کلام میں یہی عنصر سب سے زیادہ نمایاں ہے مثلاً لکھتا ہے:-

اقبال کرم می گزد ار باب ہمم را — ہمت نہ خورد نیشتر لا و نعم را
از رغبت دنیا الم آشوب نہ گردم — زیں باد پریشاں نہ کنم زلف الم را
از نقش و نگار در و دیوار شکستہ — آثار پدید است صنادید عجم را
انا نہ بود وصف اضافی ہنر ذات — ایں فتوی ہمت بود ارباب ہمم را

قصاید میں شعرا کی مجال نہ تھی کہ اپنا ذکر کر سکیں، عرفی چونکہ بالطبع نہایت ہی غیور تھا اس لئے مدحیہ کلام میں اپنے فضایل اور اوصاف جی کھول کر بیان کرتا اور مزے لے لے کر کہتا ہے، شاید ہی کوئی قصیدہ ایسا ہو جس میں کافی شعر فخریہ نہ ہوں، چنانچہ کہتا ہے:-

خدایگانہ بگویم بہ مدح خویش دو بیت — کزاں نیار و پرہیز کرد طبع سلیم

مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ اہل ادب نے انواع شاعری میں فخریہ کو ایک خاص صنف قرار دیا ہے، فارسی میں اس خاص صنف میں عرفی کا کوئی ہمسر نہیں، ہر قطعہ عجیب نئے اسلوب سے فخریہ لکھتا ہے اور اس جوش سے لکھتا ہے کہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے:-

سپہر کمن ار گوید صد ہیبت بلند — کہ دماغش شدہ از حسن طبیعت مختل
گفت الف رموزست نہ دریا و نہ کاں — حکمت آموز عقول ست نہ علم و نہ عمل
لمعات معانی ست کہ بروے جوشند — ہمہ خورشید شود گر بشناسند محل
اگر او نامزد ننگ شد از ذلت شعر — شعر از عزت او نیک بر آید ز ذلل

مختصر یہ کہ عرفی کا کلام اس طرح کے مضامین سے بھرا پڑا ہے۔

افسوس یہ ہے کہ عرفی کی آزادی طبع اور خود داری منجر بہ "کبر" ہو گئی تھی۔ چنانچہ تمام مولفوں نے اس کو بد دماغ، مغرور اور خود ستا لکھا ہے، اساتذہ سلف کو اپنے مقابلہ میں ہیچ سمجھتا ہے۔ جیسا کہ ذیل کے اشعار سے صاف ظاہر ہے:

انصاف بدہ بوالفرج و انوری امروز — بہر چہ غنیمت نہ شمارند عدم را

تفرجے کہ من از بہر روح ساز دہم — نہ انوری نہ فلانے دہد نہ بہمانی

دم عیسیٰ تمنا داشت خاقانی کہ برخیزد — بہ امداد صبا اینک فرستادم بہ شروانش

پروفیسر براؤن[1] کا قول ہے

"ان موانع اور خود اپنی مسلمہ قابلیت کے باوجود عرفی کے ناقابل برداشت غرور اور بد دماغی نے اسے ہر دل عزیز نہ ہونے دیا اور اس کے کئی دشمن پیدا ہو گئے جو شاعر خود اپنے متعلق یہ دعویٰ کرے:

نازش سعدی بہ مشت خاک شیراز چہ بود — گر نہ می دانست باشد مولد و ماوائے من

وہ گویا خود اپنے ہاتھ تنقید اور تنقیص کے دروازے کھولتا ہے۔۔ اپنے ابنائے وطن میں مقبول نہ ہونے کی بڑی وجہ اسکی یہی بد دماغی ہے، کیونکہ ظاہر ہے ایرانی اپنی قوم اور اپنے مشاہیر ملک کی اس طرح توہین و تذلیل کیوں گوارا کرنے لگے"

لیکن ان اشعار میں جن کی بنا پر پروفیسر براؤن نے عرفی کو بد دماغ سمجھا ہے، اور جن کی وجہ سے پوری ایرانی قوم اور مشاہیر ملک کی توہین و تذلیل ہوتی، غرور اور نخوت کے بجائے شاعرانہ تعلی کو زیادہ دخل ہے، اور اگر جستجو کی جائے تو کم و بیش ہر شاعر کے یہاں اس طرح کے دو چار شعر ضرور مل جائیں گے

لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ، اس میں خود رائی و خود ستائی پائی جاتی تھی۔ چنانچہ بدایونی لکھتا ہے:۔

"اما از بس عُجب و نخوت پیدا کرد از دلہا افتاد" یہ قول بھی عصبیت سے پاک نہیں، حالانکہ مولانا شبلی، بدایونی کو عرفی کا بڑا مداح سمجھتے ہیں، اگرچہ واقعہ ایسا نہیں ہے کیونکہ جو اس کی وفات کی تاریخ "دشمنِ خدا" سے نکالے وہ اس کا (عرفی) دوست کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔

ابوالفضل نے اس کے فخر و ادعا کو برا کہا ہے لیکن یہ بھی عرفی کا بڑا حریف تھا اس لئے اس کے قول میں صداقت کا عنصر کم سمجھنا چاہئے۔

"درے از سخن سرائے بر و کشودہ بود و در خود نگریست و بر پاستانیاں زبان طعن کشود، غنچۂ استعداد [illegible] د"

حیرت ہے کہ جب عرفی کے "غنچۂ استعداد" کو "نشگفتہ" کہا گیا ہے تو پھر کونسا شاعر ہو سکتا ہے جس کے استعداد کو "شگفتہ" کہا جائے گا۔ سولف میخانہ نے اس سلسلہ میں بہت دلچسپ معلومات بہم پہونچائی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ عرفی میں بے ادبی کے سوا کوئی دوسرا عیب نہ تھا۔ چنانچہ حضرت شیخ نظامی کی تحقیر کی وجہ سے اس کو برے نتائج دیکھنے پڑے یعنی

(۱) ابھی پورے چالیس سال کا بھی نہ ہوا کہ فرشتۂ اجل نے اس کی روح قبض کر لی۔

(۲) مرتے وقت کلمۂ شہادت کے بجائے بے معنی فقرات زبان پر جاری تھے۔ عرفی کے مرض الموت کے وقت مرزا نظام قزوینی جو کشمیر کے بخشی اور دیوان تھے اکبر بادشاہ کے حکم سے اس کے پاس گئے۔ مزاج دریافت کرنے پر اس کی حالت بے حد خراب پائی۔ اس کے منہ سے سوائے مزخرفات کے کچھ نہ نکل سکا۔

(۳) جب مؤلف مذکور عرفی کے حالات لکھ رہا تھا، ایک بزرگ اسکے کمرے میں داخل ہوئے اور مولوی معنوی کے حسب ذیل اشعار پڑھے :۔

از ادب پر نور گشتست ایں فلک — وز ادب معصوم و پاک آمد ملک
بد زگستاخی کسوفِ آفتاب، — شد عزازیلے ز جرأت رجمِ باب
از خدا خواہیم توفیقِ ادب — بے ادب محروم ماند از لطفِ رب

مولف نے دل میں سوچا کہ یہ اشارہ ہے سوء جانب اللہ "بنا بر سروش غیبی"

(۴) صاحب میخانہ نے شب جمعہ میں خواب دیکھا کہ عرفی درویش مذکور کے ساتھ ایک پر فضا باغ میں ٹہل رہا ہے۔ مؤلف کو دیکھ کر مخاطب ہوا کہ حضرت شیخ نظامی کے ساتھ مجھ سے جو بے ادبی ہو گئی اس کی وجہ سے میں اس قدر پریشان ہوں کہ قیامت تک میرا سر نہیں اُٹھ سکتا۔ لیکن خدا کا ہزار شکر ہے کہ حضرت امیر المومنین کی مداحی کے صلہ میں میرے گناہ معاف ہو گئے اور حضرت شیخ نے بھی میری خطا درگزر کی، حضرت درویش نے آپ کے سامنے جو اشعار پڑھے تھے وہ ان کے پڑھنے میں حق بجانب تھے۔ وہ بزرگ اب میرے حال پر مہربان ہیں اور کل آپ کے پاس جائیں گے"۔

دوسرے دن دو نمازوں کے درمیان وہی فقیر مولف کے پاس آیا اور خواب کا واقعہ جیسا مولف نے دیکھا تھا ہو بہو بیان کیا۔

اس تمام تفصیل میں مولف کے اعتقاد کو بہت زیادہ دخل ہے، اجمالاً اس کی یہ ہے کہ عرفی نے بزرگان سلف کے ساتھ ادب کا برتاؤ نہیں کیا۔

عرفی نہایت ظریف الطبع اور بذلہ سنج تھا، اس کی حاضر جوابی کے سلسلہ میں شعر العجم میں دو واقعہ مذکور ہیں، ایک فیضی کے ساتھ واقع ہوا، دوسرا ابو الفضل کے ساتھ، اوپر اس پر مختصر بحث گزر چکی ہے کہ اول الذکر ممکن ہے کہ صحیح ہو، لیکن آخر الذکر سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ [illegible] کا قطعہ

عرفی نے کسی شخص کی ہجو لکھی ہے اپنی زبان آلودہ نہ کی، البتہ اس کو یہ چیز نہایت ناگوار تھی کہ کوئی ایسی چیز تحفۃً بھیجے جو قابل پیش کش نہ ہو، ایک بار نعمت اللہ نے معمولی شال عرفی کے پاس روانہ کی۔ اس نے جواب میں ایک طنز آمیز خط معہ تین رباعیوں کے جو شال کی ہجو کے بارے میں تھی، لکھا، اکبر بادشاہ نے اس کو ایک گھوڑا انعام میں دیا چنانچہ ایک رباعی اس گھوڑے کی ہجو میں سپرد قلم کر کے روانہ کر دی۔

عرفی کی زندگی فسق و فجور سے پاک تھی۔ ایک بار کسی نے اس پر فسق کا الزام دیا جس کا اسے بے حد صدمہ ہوا اور ایک قطعہ میں اس کا اظہار کیا اور خاتمہ میں اپنے دل کو تسلی دی۔

غرض عرفی جیسے بلند پایہ شاعر اور خود دار انسان بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔

(ڈاکٹر) نذیر احمد ام۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔

عہد عباسی کا ایک تاریخی واقعہ

(جسے تاریخ نے نظر انداز کر دیا)

عباسی خلیفہ "المتوکل علے اللہ" مسند پر جلوہ افروز ہے سامنے ایک نہایت حسین کنیز (سناء) سر جھکائے مودب کھڑی ہے، اور اس کی خوبصورت آنکھوں میں شکر و مسرت کے آنسو جھلک رہے ہیں۔

خلیفہ نے اس سے مخاطب ہو کر کہا:۔ "کل میں تیرا گانا سنکر بہت خوش ہوا اور خصوصیت کے ساتھ تیرا وہ نغمہ تو مجھے بہت پسند آیا جو تو نے روم میں سیکھا اور وہیں کی زبان میں سنایا۔ یہ زیور لے۔ میں تجھے اظہار خوشنودی میں دیتا ہوں"۔

سناء نے یہ سنکر نہ اپنا سر اُٹھایا نہ کوئی بات کی، بلکہ اسی طرح خاموش کھڑی رہی۔

خلیفہ بولا :۔ "اے سناء، اگر تو کچھ اور چاہتی ہے تو بتا وہ کیا ہے"۔

سناء نے نہایت نرم و شیریں آواز میں جواب دیا کہ "امیر المومنین کے لطف و کرم نے اس کنیز کو اتنا کچھ دے رکھا ہے کہ اب اس میں کسی اضافہ کی ضرورت نہیں، لیکن اے میرے آقا، میرے دل میں ایک بات ہے جو میں اس وقت کہنا چاہتی ہوں"۔

خلیفہ نے کہا:۔ "ضرور کہو اور اگر وہ کوئی راز ہے تو بھی مجھ سے نہ چھپاؤ"۔

سناء بولی کہ:۔ "اگر امیر المومنین کی زندگی خطرہ میں نہ ہوتی، تو شاید میں اسے ظاہر نہ کرتی لیکن اس صورت میں، اس کو چھپانے کی قدرت مجھ میں نہیں ہے"۔

خلیفہ نے حیرت سے کہا کہ:۔ "اے سناء، جلدی کہہ وہ کیا بات ہے، کیا خطرہ ہے، جو میری [illegible] تعلق رکھتا ہے"۔

سناء نے کہا کہ "اے میرے آقا، آپ اُس نصرانی طبیب سے ہوشیار رہیں، جس پر آپ کو اس [illegible] اعتماد ہے اور جس پر امیر المومنین انعامات کی بارش فرماتے رہتے ہیں، وہ آپ کی ہلاکت کی فکر میں ہے کیونکہ آپ اسکے ہم مذہب لوگوں پر سختی کرتے رہتے ہیں"۔

خلیفہ نے حیرت سے پوچھا:۔ "کیا تو حُنین العبادی کے متعلق ایسا کہتی ہے"۔

اس نے جواب دیا :۔ "ہاں، اے میرے آقا، وہی"۔

خلیفہ نے کہا:۔ "تعجب ہے میں نے تو ملک کے تمام علماء و اطباء میں اُسے سب سے اونچی جگہ دے رکھی ہے اور میں اپنی غیر ذمی رعایا پر سختی بھی نہیں کرتا، البتہ جو کسی جرم کے مرتکب ہوتے ہیں انھیں ضرور سزا دیجاتی ہے"۔

سناء بولی کہ "اے میرے آقا یہ درست ہے، لیکن حُنین تو ایسا ہی سمجھتا ہے کہ آپ نصاریٰ پر ظلم کرتے ہیں اور اس لئے وہ آپ کی ہلاکت کی فکر میں ہے۔ بہرحال اس کنیز کی التجا یہی ہے کہ امیر المومنین ہوشیار رہیں، ممکن ہے حُنین دوا یا غذا میں کسی وقت زہر ملا کر کھلا دے"۔

یہ سُنکر امیر المومنین کے دل میں بھی اندیشہ پیدا ہوگیا اور سوچنے لگا کہ حقیقت کا علم کیونکر ہو سکتا ہے اور اس راز کے بے نقاب ہونے کی کیا صورت ہے۔

سناء، نہایت حسین کنیز تھی اور اس قدر خوش آواز کہ جو شخص اس کا گانا سنتا مسحور ہو جاتا۔ روم کے بردہ فروش اسے پکڑ کر دار الخلافہ میں لے آئے تھے اور یہیں وہ "کنیز روم" کے نام سے قصر امارت میں داخل ہوئی تھی۔ خلیفہ اسکی بڑی قدر کرتا تھا اور جس وقت وہ رومی گانے سناتی تھی تو مست ہو جاتا تھا۔

طبیب کا نام جس کی شکایت کی گئی تھی ابو زید حنین بن اسحاق العبادی تھا اور حیرہ کی نصاریٰ جماعت سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا باپ دوا سازی کی دوکان رکھتا تھا اور اسنے اپنے لڑکے حُنین کو یوحنا بن موسویہ کی خدمت میں تحصیل علم طب کے لئے بھیجدیا تھا۔ لیکن کچھ دن بعد یہ یوحنا سے خفا ہو کر اپنے وطن گیا اور وہاں سے بلاد روم کا سفر کیا۔ یہاں اس نے یونانی زبان حاصل کر کے مختلف علوم میں مہارت پیدا کی اور یونانی کتابوں کا ترجمہ سریانی اور عربی زبان میں کیا۔

مامون الرشید کا آخری زمانہ تھا جب وہ بغداد آیا اور دفتر ترجمہ سے متعلق ہوگیا، اس نے فن طب کی بڑی خدمت انجام دی اور طبیب حاذق کی حیثیت سے بہت مشہور ہوگیا۔ جب خلیفہ المتوکل علی اللہ کا زمانہ آیا تو اس نے بہت عروج حاصل کیا اور خلیفہ نے علاوہ قیمتی عطایا کے زمین کا ایک بڑا رقبہ بھی جاگیر میں دیدیا۔

حُنین کا خط

حُنین :۔ "امیر المومنین نے مجھے یاد فرمایا تھا اس لئے میں حاضر ہوا ہوں اور ارشاد گرامی کے سننے کا منتظر ہوں"

خلیفہ :۔ "ہاں [illegible] نے تجھے ایک بڑی اہم خدمت انجام دینے کے لئے طلب کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی [illegible] اس خدمت کو انجام نہیں دے سکتا"۔

حُنین :۔ "اے امیر المومنین، یہ خاکسار ہر خدمت کے لئے حاضر ہے، ارشاد ہو"۔

خلیفہ :۔ "اے حُنین تم جانتے ہو کہ میرے دشمن بہت ہیں اور بغاوت کے لئے وقت کے منتظر ہیں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ قبل اس سے کہ وہ مجھ پر قابو پائیں، میں ان کا فیصلہ کر دوں"۔

حُنین :۔ "امیر المومنین کا یہ خیال بالکل درست ہے اور اس سے زیادہ مسرت میرے لئے کیا ہو سکتی ہے کہ میں امیر المومنین کی تدابیر کو کامیاب بنانے میں مدد کروں۔ لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ دشمن کون ہیں اور ان کا شر دور کرنے کی کیا تدبیر

امیر المومنین نے سوچی ہے۔"

خلیفہ :۔ "اب یہ نہ پوچھو کہ دشمن کون کون ہیں، تم تو ان کا شر دور کرنے میں میری مدد کرو اور وہ یہ ہو سکتی ہے کہ تم مجھے نہایت مہلک زہر طیار کر کے دو۔"

حُنین :۔ "اس میں شک نہیں میں نے حصول طب میں کافی وقت صرف کیا ہے اور علوم کیمیاوی کی تحقیق میں بھی بڑا سر کھپایا ہے لیکن اے امیر المومنین، خطا معاف، میں نے زہر طیار کرنا نہیں سیکھا۔"

خلیفہ :۔ "اے حُنین، میں تجھ کو پانچ ہزار دینار دیتا ہوں، جس طرح ممکن ہو اس کام کو انجام دو۔"

حُنین :۔ "اے امیر المومنین، باور فرمایئے کہ مجھے صرف انھیں دواؤں کا علم ہے جو موت سے بچانے والی ہیں اور موت لانے والی دواؤں کی طرف سے میں بالکل جاہل ہوں۔"

خلیفہ :۔ "کیا تو انکار کرتا ہے"

حُنین :۔ "ہاں، انکار کرتا ہوں، اس لئے کہ یہ میری قدرت سے باہر ہے۔"

اس گفتگو کے ختم ہونے کے بعد ہی ایک گھنٹہ کے اندر حُنین قید خانہ میں تھا جہاں اسے طرح طرح کی تکلیفیں پہونچائی جا رہی تھیں جب صبح ہوئی تو خلیفہ نے اسے پھر طلب کیا اور پوچھا :۔ "کیا تو ابتک اپنی ضد پر قایم ہے۔" اس نے جواب دیا کہ "اے امیر المومنین یہ ضد و نافرمانی نہیں ہے، بلکہ استقامت ہے اس عہد پر کہ میں صرف وہی دوائیں بناؤں گا جو موت سے بچانے والی ہیں اور ہلاک کرنے والی چیزوں کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔"

خلیفہ نے یہ سنکر کہا کہ "بہتر ہے، اب تم اپنی موت کے لئے طیار ہو جاؤ کیونکہ میں تمھارے قتل کئے جانے کا حکم دے رہا ہوں۔"

حُنین نے کہا کہ "امیر المومنین کو اختیار حاصل ہے، میں مر سکتا ہوں لیکن کسی کو مار نہیں سکتا۔"

یہ سُن کر خلیفہ مسند سے اُٹھ کھڑا ہوا اور حُنین کو اپنے گلے لگاتے ہوئے بولا کہ "اے حُنین [illegible] تیری شرافت اور علوئے نظر کا امتحان لے رہا تھا اور شکر ہے کہ تو اس میں کامیاب ثابت ہوا" اور یہ کہکر خلیفہ نے [illegible] یا کی بارش سے اور زیادہ گرانبار کر دیا۔

خلیفہ حسب معمول دربار میں جلوہ افروز ہے، سناء اور حُنین دونوں سامنے کھڑے ہوئے ہیں اور وہ ان دونوں کی صورت دیکھ رہا ہے۔ کچھ دیر بعد خلیفہ نے سناء سے مخاطب ہو کر کہا :۔ "اے سناء تو اس شخص کو جانتی ہے" لیکن اس کا کنیز نے کوئی جواب نہ دیا، اس کے بعد خلیفہ نے حُنین سے کہا "اے حُنین، یہ کنیز کہتی ہے کہ تم مجھے زہر دیکر ہلاک کرنے کی فکر میں ہو، کیا یہ صحیح ہے۔"

حُنین نے کنیز سے مخاطب ہو کہا۔ "اے انستاسیا، کیا یہ صحیح ہے"۔

خلیفہ کنیز کا یہ نیا نام سنکر حیران رہگیا اور حُنین سے پوچھا کہ کیا تو اس سے واقف ہے اور تو نے اس کا یہ نام کیونکر جانا"۔

لیکن حنین کے جواب دینے سے پہلے ہی سناء، خلیفہ کے قدموں پر گر پڑی اور رو رو کر کہنے لگی کہ "اے امیرالمومنین، میں قصوروار ہوں اور میں نے اس پر تہمت لگائی تھی - واقعہ یہ ہے کہ میں بہت چھوٹی تھی جب بحر روم کے ایک ساحلی مقام پر اس سے متعارف ہوئی۔ یہ اُس وقت وہاں کے علمائے طب سے جن میں میرا باپ بھی شامل تھا طب پڑھ رہا تھا۔ مجھے اس سے محبت ہوگئی لیکن اس نے میری محبت کو رد کر دیا اور کہا کہ "میں اپنے وطن ہی کی عربی لڑکی سے شادی کروں گا"۔ یہ سن کر مجھے سخت صدمہ ہوا۔ اس کے بعد میں اپنے باپ کے گھر سے بھاگ گئی اور حیرہ کی طرف جانے والے ایک قافلۂ تجار کے ساتھ مل گئی۔ تاکہ حیرہ پہونچکر پھر اس سے ملوں، لیکن حیرہ پہونچکر معلوم ہوا کہ وہ بغداد میں ہے اس لئے میں بغداد کی طرف چل پڑی، لیکن راستہ میں کُردوں کے ایک گروہ نے مجھے گرفتار کر لیا اور میں کنیز کی حیثیت سے امیرالمومنین کی خدمت میں پہونچ گئی۔ یہاں پہونچکر جب مجھے معلوم ہوا کہ جس کے پیچھے میں تباہ ہوئی تھی وہ یہیں ہے اور صاحب اہل وعیال بھی ہے تو آتش انتقام میرے دل میں بھڑک اُٹھی اور اس لئے میں نے اس پر تہمت لگائی تھی"۔

یہ کہکر وہ حُنین کی طرف مخاطب ہوئی اور بولی کہ "اے حُنین، یقین کر کہ جس طرح تجھ سے جدا ہوکر میری محبت مر چکی تھی اب تجھے دیکھ کر میری نفرت بھی ختم ہوگئی ہے اور میں اپنے آقائے ولی نعمت کے سامنے اپنی خطا کا اعتراف کرتی ہوں"۔

خلیفہ نے طبیب سے پوچھا "اے حُنین کیا تم اس کی غلطی کو معاف کر دوگے"۔

حُنین نے کہا "اگر امیرالمومنین معاف فرمادیں تو مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے"۔

خلیفہ نے سناء سے کہا "میں اور حُنین دونوں تیری خطا سے درگزرتے ہیں، لیکن آیندہ پھر کبھی ایسی حرکت نہ کرنا"۔

سناء جو اب تک [illegible] طرح تاثر سے زار زار رو رہی تھی حُنین سے مخاطب ہو کر بولی کہ "اے حُنین اب میری صرف ایک التجا ہے اور وہ یہ [illegible] حُنین سے مجھے مانگ لو تاکہ میں باقی عمر تمھاری خدمت میں بسر کر دوں اور تمھارے بچوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوں"۔

خلیفہ نے یہ سنکر کہا "اے سناء، میں تجھے آزاد کرتا ہوں اور اگر تو چاہے تو حُنین کے ساتھ جا سکتی ہے"۔

سناء، حنین کے ساتھ چلی گئی اور حُنین کی زندگی بحر ۲۶۴ھ تک برابر اس کی خدمت کرتی رہی۔

ایک ذاتی کتب خانہ فروخت ہو رہا ہے

جس میں بعض نہایت نادر کتابیں ہیں۔ ذیل کے پتہ سے خط و کتابت کیجئے:۔

ام۔ عبدالحمید نعمانی۔ پوسٹ بکس ۴۹ - راولپنڈی

جذبات عالیہ اور اُردو شاعری

۱۔ انسان، فطرت، زندگی، ماحول و کائنات ۔ یہی وہ پانچ موضوع فکر و ادب ہیں جن کی وسعتوں کی کوئی انتہا نہیں، اور مفکرین زیادہ تر انھیں پر غور کرتے ہیں، لیکن ان سب میں اہم ترین موضوع خود انسان ہے۔

۲۔ انسان نہ عقل ہی عقل ہے اور نہ محض جذبات کا پتلا، وہ عقل کی مدد سے چیزوں کی ماہیت اور اشیاء عالم کی حقیقت پر غور کرتا ہے اور وجدان کی راہ سے اپنے جذبات کو اُبھارتا اور پھر ان سے خوشی یا غم محسوس کرنے لگتا ہے، چنانچہ قدیم کتابوں میں جابجا یہ بات نظر آتی ہے کہ انسان نے کائنات کی اشیاء پر غور کرتے کرتے جذبات کی راہ سے، خیال کی دنیا بسائی اور اُس میں ایسی لذت محسوس کی کہ ان تحریروں کو آسمانی حیثیت دیدی۔ رگوید مقدس کے گیتوں، زبور کے نغموں میں یہی بات آپ کو ملے گی۔

۳۔ انسانی جذبات کو بہترین طریقے پر پیش کرنے کا کام فنون لطیفہ نے اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ اگرچہ افلاطون نے چیزوں کی افادیت کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہوئے فنونِ لطیفہ کو غیر ضروری ٹھہرایا، یہاں تک کہ اس نے شاعری اور شاعر کو اپنے مجوزہ دستور "ریاست" سے خارج کر دیا، لیکن انسان نے اس بات کو اچھی طرح محسوس کر لیا کہ احساسات کی نزاکتوں اور جذبات و تاثرات کو کامل طور پر محفوظ کرنے کا طریقہ فنون لطیفہ ہی ہیں اور ان میں بھی خصوصیت کے ساتھ شاعری۔ افلاطون نے یہ کہکر کہ "شاعری نقل کی نقل ہے" اس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے شاگرد ارسطو نے اپنی معرکہ آرا تصنیف بوطیقا میں نظریۂ شعر کی کافی تردید کر دی ہے۔

شاعری پر غور کرتے وقت زمانۂ گزشتہ کے نقاد زیادہ تر بحث کی ابتدا افلاطون [illegible] (Theory of Imitation) سے کرتے رہے ہیں اور تسینگ تک یہی رنگ فکر غالب رہا، لیکن رفتہ رفتہ تحقیق و تجسس [illegible] ہوئی کہ شاعری اور فنونِ لطیفہ کا اظہار فطرت انسانی کے بنیادی اُصولوں کے تحت کئی وجوہ سے ضروری اور ناگزیر تھا اور [illegible] شاعری اور فنونِ لطیفہ کا سرچشمہ، عقل محض نہیں، وجدان ہے، جس کا طریق کار عقل سے جداگانہ ہے۔

انسانی ذہن میں دو مختلف صلاحتیں ہیں: عقل اور وجدان۔ عقل کا کام حقایق و معلومات کو بغیر آمیزشِ جذبات کے فراہم کرنا اور نتائج حاصل کرنا ہے۔ بخلاف اس کے وجدان کی راہ، عقل سے ایک حد تک مختلف ہے۔ وہ چیزوں کی ماہیت کے مطالعہ میں ذہن کی ان قوتوں سے بھی مدد لیتا ہے جن سے سائنس وغیرہ میں بالکل مدد نہیں لیجاتی ——— اسی لئے شاعری جس لطافت کا مطالبہ کرتی ہے، وہ عقل محض کی خشکی میں نشوونما نہیں پا سکتی۔

ہر بلند شاعری میں شفائی قوت (Healing Power) اور سکون بخش صفات کی موجودگی ضروری ہے مثلاً نرمی و لطافت، نزاکت و معصومی، گم شدگی، وغیرہ وغیرہ، اس میں حقایق کا سا تلاطم اور افکار کا انتشار نہ ہونا چاہئے ورنہ وہ اس خاموش تبسم کو کھو دیگی جو طلوع سحر یا غروب آفتاب کی طرح اس میں ہونا چاہئے، یہ صفتیں اس وقت تک صحیح طور پر پرورش پا نہیں سکتیں جب تک وجدان کے نور کی ہدایت، فکر شاعری دستگیری نہ کرے۔ عقل محض سے یہ راہ طے نہیں ہوتی۔

وجدان کی حکمرانی کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ عقل کو شاعری سے بالکل خارج کر دیا جائے کیونکہ انسانی ذہن کی کوئی قوت شاعری کی دُنیا سے الگ نہیں کی جا سکتی۔ انسانی زندگی میں ہم برابر یہ محسوس کرتے رہتے ہیں کہ کہیں عقل، وجدان پر غالب آجاتی ہے اور کبھی وجدان عقل پر۔ اسی طرح شاعری میں بھی یہی جنگ و جدل جاری ہے

شاعری اور جذبات میں وہی رابطہ ہے جو جسم و روح میں جس طرح روح کی پاکیزگی اور نفس و ضمیر کی طہارت پر وجود کی عزت و قدر و منزلت کا انحصار ہے۔ اسی طرح جذبات کی شعری صداقت و بلندی پر شاعری کی قدر و قیمت بڑی حد تک منحصر ہے۔ اُردو شاعری میں جان صاحب، سعادت یار خاں، رنگین اور میاں چرکین کے کلام کو جو کم وقعتی حاصل ہے اس کا خاص سبب یہی ہے کہ ان کے جذبات میں وہ بلندی و رفعت موجود نہیں، جو میر و غالب، ولی اور مومن کے کلام میں پائی جاتی ہے۔

مشہور انگریزی شاعر شیلی (Shelley) کی رائے میں شاعری جذبات کی مصوری کا نام ہے اور کارلائل کی نظر میں شاعری موسیقیانہ خیال ہے۔ گویا ان دو ناقدوں کی نظر میں شاعری میں حسب ذیل صفات ہونا چاہئے:۔ (۱) جذبات۔ (۲) مصوری۔ (۳) موسیقی اور (۴) خیال و افکار

بے شک اگر شاعری میں جذبات کی صداقت و رفعت، پاکیزگی اور لطافت، آئین مصوری و کمال موسیقی اور تازگی فکر و خیال پر نظر رکھے تو وہ فنون لطیفہ کی اعلیٰ ترین نمایندہ بن جائے گی۔ بشرطیکہ وہ ان اوصاف سے بھی متصف ہو، جو شعری صنعت گری کے لئے ضروری ہیں، چنانچہ انگریزی کا کیٹس کی نظم (Sleeping Beauty) "حسن خوابیدہ" اور اُردو میں اقبال کی متعدد نظمیں پیش کی جا سکتی ہیں جو بیک وقت جذبات اور خیال و افکار کی تازگی غیر معمولی شگفتگی پیدا کر رہی ہے۔

شاید کہ [illegible] شاعری، جذبات کی رفعت اور احساسات کی نزاکت و پاکیزگی کی جو مثالیں پیش کر رہی ہے وہ جدید شاعری کا نتیجہ ہیں [illegible] ادب و شعر کا گہرا اثر ہے۔ بے شک مغربی شاعری نے آزاد اور حالی کی وساطت سے مشرقی شاعری کو متاثر کیا تاہم قدیم اُردو شاعری میں بھی انسانی فطرت کی تنقید و ترجمانی اور جذبات عالیہ کی عکاسی و مصوری انتہائی کمال سے کی گئی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

مصائب اور تھے پر دل کا جانا — عجب اک سانحہ سا ہو گیا — میر

خانہ خراب عشق نے دُنیا سے کھو دیا — کیا پوچھتے ہو حال ہمارا سُنا نہیں — فغاں

مرگ مجنوں پہ عقل گم ہے میر — کیا دوانہ نے موت پائی ہے — میر

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے ۔۔۔ دل ہوا ہے چراغ مفلس کا — میر

غیر سے ملنا تمہارا سن کے گو ہم چپ رہے ۔۔۔ پر سنا ہوگا کہ تم کو اک جہاں نے کیا کہا — قایم

میرے غم خانہ کی قسمت جب رقم ہونے لگی ۔۔۔ لکھدیا منجملۂ اسباب ویرانی مجھے — غالب

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم ۔۔۔ گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو — "

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی ۔۔۔ تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں — انشا

انیس دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ ۔۔۔ چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے — انیس

ان اشعار کے مطالعہ سے ہم اس نتیجہ پر بہ آسانی پہونچ سکتے ہیں کہ شاعری فطرت انسانی کے چہرے سے نقاب اُٹھا دیتی ہے اور ہمیں چھوٹی چھوٹی باتیں بہت انوکھی اور دلچسپ معلوم ہونے لگتی ہیں۔ ہمارے قدیم غزل گو شعراء نے انسانی فطرت کی صداقتوں اور حیات انسانی کی سچائیوں کو جس اختصار اور جامعیت سے بیان کیا ہے، اس کی مثال مغربی شاعری میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ مغربی شعراء کا طرز بیان زیادہ تر بیانیہ ہوتا ہے۔ پہلے وہ کسی واقعہ کو بیان کرتے ہیں اور پھر اپنے تاثرات و احساسات پیش کرتے ہیں۔ اہل مغرب کا دل و دماغ عموماً واقعہ بینی اور تجزیہ پسندی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ بہ خلاف اس کے مشرق کے نازک خیال شعراء اپنے ذاتی تاثرات کے اظہار پر زیادہ توجہ کرتے ہیں۔

ہماری قدیم شاعری کے یہ نمونے صاف طور سے یہ بات واضح کرتے ہیں کہ:- (۱) انسانی فطرت کی بہترین ترجمانی ان میں جابجا موجود ہے (۲) کائنات کو جس وجدانی اور شعری نگاہ سے ان شعراء نے دیکھا، اس میں اچھی خاصی وسعت اور گہرائی ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ جو وسعت اور تنوع انگریزی شاعری میں ملتا ہے، وہ اُردو غزل گوئی [illegible] موجود نہیں ہے۔ لیکن جہانتک گہرائی کا تعلق ہے اُردو شاعری مغربی شعر و شاعری سے کسی طرح کم نہیں اور اُردو کے ممتاز [illegible] فطرت و حیات کی طرف توجہ کی تو فکر و تخیل کی مدد سے جو اشعار ظہور میں آئے، وہ انسان کے جذبات عالیہ کو تسکین [illegible] آج بھی موثر ہیں۔ مثلاً میر حسن کی مثنوی سحر البیان کے وہ حصے جہاں وہ عاشق شہزادی کے جذباتِ الفت کی [illegible] کی مصوری کرتے ہیں یا مثنوی زہر عشق کے وہ اشعار جن میں "اس کی" وفات اور وصیت کا ذکر ہے؟ یا یہ اشعار

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام ۔۔۔ آفاق ہے اس کارگہ شیشہ

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم ۔۔۔ یک شعلہ برق خرمن صد کوہ طور تھا

رہی نگفتہ مرے دل میں داستاں میری ۔۔۔ نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر ۔۔۔ ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے مونہ پر رونق ۔۔۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

ناز ہے جذب دل کا شکوہ دیکھ جرم کرکے ہم ۔۔۔ نہ کیجے ہم جو اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

وہ تو کل دیر تلک دیکھتا ایدھر کو رہا ہم سے ہی حال تباہ اپنا دکھایا نہ گیا
مہ نے آسامنے شب یاد دلایا تھا اُسے، پھر وہ تا صبح میرے جی سے بھلایا نہ گیا

رواج عشق کے آئیں وہی ہیں کشور دل میں رہِ رسم و وفا جاری جو آگے تھی سواب بھی ہے
گو ہاتھوں میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم سے رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں،
وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ ہم کو حریص لذت آزار دیکھکر

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجئے ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہ ہوا

اُردو شاعری کا گراں بہا سرمایہ غزل ہے اور اس لئے ان کی غزلیہ شاعری زیادہ تر داخلی شاعری ہے چونکہ اہل مشرق کا فطری میلان یہی ہے کہ وہ داخلیت سے زیادہ دلچسپی نہیں - پھر چونکہ اہل مشرق فلسفیانہ مسایل میں ( )
کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے اور شعر و ادب میں واقعہ نگاری سے زیادہ خیال آرائی پر توجہ دی اسلئے یہاں کی شاعری میں رزمیہ واقعات کو وہ جگہ نہ مل سکی جو یونان میں ہومر کی بدولت حاصل ہوئی - یہاں دل کی آنکھ سے کام زیادہ لیا گیا ہے اور وہاں چہرہ کی آنکھ سے - یہی سبب ہے کہ مغربی شاعری میں بیانیہ اور واقعاتی شاعری کا جو سرمایہ ہے وہ ہمارے یہاں موجود نہیں - اگر فردوسی کی شاہنامہ، والمیک کی رامائن اور میر انیس کے مراثی کو نظر انداز کر دیا جائے تو مشرق میں یقیناً بیانیہ اور رزمیہ شاعری کی کمی محسوس ہوگی — تاہم معیار اور پختگی کے اعتبار سے مشرق کی بیانیہ شاعری بھی کم گرانقدر نہیں -

جب اُردو شاعری نے آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا تو ماحول کی صعوبتوں نے اس کی راہ میں دقتیں پیدا کر دیں نتیجہ یہ ہوا کہ خارجی شاعری کا نشو و ارتقا رک گیا - سیاسی طوائف الملوکی نے افکار و خیالات میں وہ تازگی اور وحدت و پختگی پیدا نہ ہونے دی جو یورپ کا قطعہ [illegible] شعراء مثلاً ڈانٹے، گوئٹے، ورڈس ورتھ اور کیٹس کے یہاں پائی جاتی ہے ہمیں اس کا کھلا ہوا اعتراف [illegible] فکر اور حکیمانہ نظر جو شیکسپیر اور ملٹن وغیرہ کے کلام میں پائی جاتی ہے، اُردو شعراء میں کم ہے، تمراہ [illegible] فلسفہ الٰہیات اور تصوف سے مدد لی اور بعض عمدہ باتیں کہہ گئے - مثلاً جبر و اختیار کا مسئلہ کہ انسان مجبور محض ہے [illegible] مختار - میر نے اس کو یوں ادا کیا ہے

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی، جو چاہیں ہیں سو آپ کریں ہے ہمکو عبث بدنام کیا

یہ خیال کہ صاحب فکر و نظر صدیوں میں کہیں جا کر پیدا ہوتا ہے - میر کی شاعری میں اس طرح محفوظ ہے :-

مت سہل ہمیں سمجھو پھرتا ہے فلک برسوں تب خاک کے پردوں سے انسان نکلتے ہیں

یا یہی خیال اخلاقی نقطۂ نظر سے اس طرح کہ :

میر صاحب تم فرشتہ ہو تو ہو آدمی ہونا بڑا مشکل ہے میاں !